غالبؔ

کی

بعض تصانیف کے بارے میں

کالی داس گپتا رضاؔ

ساکار پبلشرز پرائیویٹ لمیٹیڈ۔ بمبئی

غالب

کی

بعض تصانیف کے بارے میں

کالی داس گپتا رضاؔ

ساکار پبلشرز پرائیویٹ لمیٹیڈ۔ بمبئی

پہلا ایڈیشن	:	۲۷ر دسمبر ۱۹۹۰ء
مصنف	:	کالی داس گپتا رضاؔ
پبلشرز	:	ساکار پبلی کیشنز پرائیویٹ لمیٹیڈ جولی بھون ۱ر، ۱۰ انیو مرین لائنز بمبئی ۴۰۰۰۲۰
پرنٹر	:	ملٹی پرنٹ ۔ بمبئی ۴۰۰۰۰۸
قیمت	:	۸۰ روپے

فہرست

حرفے چند

میں نے برسوں کلامِ غالبؔ کا مطالعہ کیا اور غالبیات کی گمشدہ کڑیوں کا کھوج لگانے کی کوشش کی ۔ نتیجے میں بہت سا رطب و یابس اکٹھا ہو گیا ، جو اب ہزاروں صفحات پر محیط ہے ۔ اس میں سے ایک متاع سے کچھ زیادہ چھپ کر آپ کے ہاتھوں میں پہنچ چکا ہے ، باقی آہستہ آہستہ چھپوا کر پہنچانے کی کوشش کر رہا ہوں ۔ مشکل یہ رہی ہے کہ جتنا مواد چھپ جاتا رہا ہے تقریباً اتنا ہی نیا مواد جمع بھی ہو جاتا رہا ہے ۔ لیکن نئے مواد کی فراہمی کی رفتار میں اب وہ تیزی نہیں رہ گئی ہے ۔ اس لیے بیشتر جمع شدہ مواد ہی کو ڈھنگ سے بنا سنوار کر دانشوروں کی نذر کرنا باقی رہ گیا ہے ۔ دیکھنا چاہیے ۔

اگرچہ اس کتاب کا موضوع بہت زیادہ پھیلا ہوا نہیں ہے تاہم مجھے یقین ہے کہ غالبؔ اور غالبیات کے مشتاق اس میں کام کی بعض باتیں تلاش کر ہی لیں گے ۔

کالی داس گپتا رضاؔ

بمبئی ۔ ۴۰۰۰۳۶

۲ اکتوبر ۱۹۹۰ء

غالبؔ کی زندگی میں مطبوعاتِ غالبؔ

غالبؔ کی تصانیفِ نظم و نثر میں، اگر ان مخطوطات کو بھی شامل کر لیا جائے جو اُن کی زندگی میں لکھے گئے تو یقین ہے کہ تصانیفِ قلمی و مطبوعہ کی تعداد چار درجن سے تجاوز کر جائے گی مگر مخطوطات کی تعداد میں وقفے وقفے پر اضافہ ہوتا رہتا ہے اس لیے یہاں قاری کی عام معلومات کے لیے صرف ان تصانیف کی فہرست دی جاتی ہے جو غالبؔ کی زندگی میں چھپ کر شائع ہوئیں۔ میں نے سالِ طباعت کی رعایت کو برقرار رکھتے ہوئے ایک تصنیف کے مختلف ایڈیشنوں کو بھی جداگانہ تصنیف قرار دیا ہے جن مطبوعات کی نشاندہی ○ اس طرح کی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کتاب میرے کتب خانے میں موجود ہے گویا اس وقت ۳۲ میں سے ۲۵ مطبوعات میرے یہاں موجود ہیں :

نمبر شمار	نام کتاب	ایڈیشن	تاریخ یا سالِ اشاعت		کیفیت
۱	دیوانِ اردو	پہلا ایڈیشن	اکتوبر	۱۸۴۱ء	○
۲	دیوانِ فارسی غالبؔ	؍؍		۱۸۴۵ء	○
۳	دیوانِ اردو	دوسرا ایڈیشن	مئی	۱۸۴۷ء	○

نمبر	کتاب	ایڈیشن	تاریخ	سنہ	
۴	پنج آہنگ	پہلا ایڈیشن	۴/ اگست	۱۸۴۹ء	○
۵	مثنوی بیانِ نموداریِ شانِ نبوّت و ولایت	" "	اگست	۱۸۵۲ء	نئی دریافت
۶	پنج آہنگ	دوسرا ایڈیشن	اپریل	۱۸۵۳ء	○
۷	مہرِ نیم روز	پہلا ایڈیشن	۲۸/ دسمبر	۱۸۵۴ء	○
۸	قادرنامہ	پہلا ایڈیشن (۱۲۷۳ھ)	۴ تا ۳۱ دسمبر	۱۸۵۶ء	میرے یہاں کئی ایڈیشن ہیں مگر قدیم ترین ایڈیشن ۱۸۶۹ء کا ہے
۹	دستنبو	پہلا ایڈیشن	نومبر	۱۸۵۸ء	○
۱۰	دیوانِ اردو	تیسرا ایڈیشن	۲۹ جولائی	۱۸۶۱ء	○
۱۱	قادرنامہ	دوسرا ایڈیشن	۲۶/ نومبر	۱۸۶۱ء	
۱۲	قاطع برہان	طبع اوّل	۲۱/ مارچ	۱۸۶۲ء	○
۱۳	دیوانِ اردو	چوتھا ایڈیشن	جون	۱۸۶۲ء	○
۱۴	نگارستانِ سخن (کلام ذوق و غالب و مومن)		۲۴/ اگست	۱۸۶۲ء	○
۱۵	دیوانِ اردو	پانچواں ایڈیشن	(بعد از جون)	۱۸۶۳ء	○
۱۶	کلیاتِ غالب	پہلا ایڈیشن	مئی / جون	۱۸۶۳ء	○
۱۷	قادرنامہ	تیسرا ایڈیشن	۹/ جولائی	۱۸۶۳ء	
۱۸	مثنوی ابرِ گہربار (الگ سے)	پہلا ایڈیشن		۱۸۶۴ء	○
۱۹	لطائفِ غیبی	پہلا ایڈیشن	۲/ اکتوبر	۱۸۶۴ء	○

۲۰	سوالاتِ عبدالکریم	پہلا ایڈیشن	۱۸۶۴ء	○
۲۱	نامۂ غالب	پہلا ایڈیشن	(قبل از ۱۳ اگست) ۱۸۶۵ء	○
۲۲	نامۂ غالب	دوسرا ایڈیشن	اودھ اخبار ۱۰ اکتوبر (۱۷ اکتوبر) ۱۸۶۵ء	
۲۳	دستنبو	دوسرا ایڈیشن	۱۸۶۵ء	○
۲۴	درفشِ کاویانی (قاطع برہان کا)	دوسرا ایڈیشن	نومبر/دسمبر ۱۸۶۵ء	○
۲۵	قطعۂ غالب	پہلا ایڈیشن	(قبل از ۳۱ جولائی) ۱۸۶۶ء	○
۲۶	انتخابِ غالب (جزوی طور پر ڈاکٹر ضیاالدین خان کی مرتبہ "انشائے اردو" حصہ دوم مطبوعہ فیض احمدی میں شامل)	پہلا ایڈیشن	۱۸۶۶ء	غالب کی زندگی میں یہ کتاب مکمل کبھی نہیں چھپی
۲۷	دعائے صباح	پہلا ایڈیشن	(قبل از ۲۰ نومبر) ۱۸۶۷ء	○
۲۸	تیغِ تیز	پہلا ایڈیشن	۱۸۶۷ء	○
۲۹	نکاتِ غالب (اردو) و رقعاتِ غالب (فارسی)	پہلا ایڈیشن	فروری ۱۸۶۷ء	
۳۰	سبدِ چین	پہلا ایڈیشن	اگست ۱۸۶۷ء	
۳۱	کلیاتِ نثرِ غالب	پہلا ایڈیشن	جنوری ۱۸۶۸ء	○
۳۲	عودِ ہندی (نامۂ غالب بھی شامل ہے)	پہلا ایڈیشن	۲۷ اکتوبر ۱۸۶۸ء	○
۳۳	اردوئے معلیٰ (غالب کی وفات کے انیس ۱۹ دن بعد چھپی)	پہلا ایڈیشن	۶ مارچ ۱۸۶۹ء	○

دیوانِ غالبؔ اردو

غالبؔ کو عمر بھر اپنی فارسی نظم و نثر پر ناز رہا۔ انہیں یقین تھا کہ انہیں فارسی زبان سے خداداد مناسبت ہے تاہم ان کی شہرت اردو نظم و نثر سے ہوئی۔ اردو نظم سے زیادہ اور اردو نثر سے، نظم کی نسبت کم۔ اردو نثر میں اپنے خطوں کے ذریعے انہوں نے ایک نیا اسلوب وضع کیا اور اردو نظم میں قصیدہ اور غزل (بلکہ صرف غزل) کے ذریعے ایسی "طرز تحریر اور روشِ فکر" ایجاد کی کہ آج تک اس کی تقلید ممکن نہ ہو سکی۔ اپنی باطنی کیفیت، خیال کی بلندی اور احساس کی شدت سے انہوں نے غزل کی زبان کو خصوصی تمکنت بخشی اور الفاظ و تراکیب کو ایسی وسعتیں اور گہرائیاں عطا کیں کہ ایک خاص رنگ پیدا ہو گیا ہے اور اس پر فخر بھی انہوں نے اپنے ہی رنگ میں کیا اور اسے اختیار کرنے کی بے جوتی دی۔ کہتے ہیں ؎

ادائے خاص سے غالبؔ ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

غالبؔ کی زندگی میں دیوانِ غالب (اردو) کے پانچ ایڈیشن چھپے۔

---

۱ ذوقؔ، غالبؔ اور مومنؔ کے دواوین کا ایک انتخاب "گلستانِ سخن" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ دیوانِ غالب کی تقریباً تمام غزلیں اس میں شامل ہیں۔ غالبؔ کا کہا ہوا سہرا پہلی مرتبہ اسی مجموعے میں چھپا۔ قصیدے اور قطعے بھی ہیں اگرچہ تمام کے تمام نہیں مگر کوئی رباعی درج نہیں کی گئی۔

غرضیکہ غالب کا پورا دیوان تو اس میں نہیں تاہم کلام کا وافر حصہ اس میں آگیا ہے اس لیے اسے دیوانِ غالب کا چھٹا ایڈیشن (سالِ اشاعت کی رُو سے پانچواں) کہنا زیادہ غلط نہ ہوگا۔ قوی قیاس ہے کہ یہ مجموعہ ظہیرؔ دہلوی شاگرد ذوقؔ نے ترتیب دیا تھا۔ کتاب بہت غلط چھپی ہے۔ کل صفحات ۱۷۰ ہیں مگر اس کے ص ۱۶۴ پر "تمام شد" لکھ کر یہ عبارت درج کی گئی ہے۔

"الحمد للہ۔۔۔۔ انتخاب دیوان ہر سہ شعرا۔۔۔۔۔۔۔۔ ذوقؔ۔۔۔۔۔
غالبؔ۔۔۔۔۔ مومنؔ درین چند اوراق حسب فرمائش لالہ جے نرائن صاحب
سوداگر کتب در مطبع احمدی واقع شاہدرہ دہلی بحسن اہتمام میرزا اموجان
حلیۂ انطباع پوشید بتاریخ بست ہفتم صفر ۱۲۷۹ھ ہجری (۲۴ اگست ۱۸۶۲ء)
تمام شد"

ص ۱۷۰ پر خاتمے میں مزید اطلاع دی گئی ہے۔

"در خدمت ہمہ صاحبان عرض است کہ ۳ جزو کتاب ہذا از جانب شروع در مطبع دیگر اولاً طبع شدہ بود و بعد از ۳ جزو تا تمام در مطبع بندہ طبع گردید۔ فقط۔ الراقم بندہ اموجان مہتمم مطبع احمدی"۔

اتفاق سے میرے غالب کلکشن میں یہ چھیوں ایڈیشن موجود ہیں۔

ان میں پہلا ایڈیشن اور چوتھا ایڈیشن نہایت اہم ہیں۔ پہلا اس لیے کہ یہ نہایت کمیاب ہے (ظاہر ہے کہ اس میں سب ایڈیشنوں سے کم شعر ہیں)، نیز یہ غالب کی مطبوعہ اردو شاعری کے سفر میں پہلا قدم ہے اور چوتھا اس لیے کہ اس میں سب ایڈیشنوں سے زیادہ شعر ہیں اور اس کی بنیاد تیسرے ایڈیشن کا وہ نسخہ ہے جو خود غالب نے اپنے قلم سے درست اور نظر ثانی کر کے اشاعت کے لیے دیا تھا۔ ذیل میں ان تمام ایڈیشنوں کی ضروری تفصیل دی گئی ہے۔ مگر اُن کوائف کو نظر انداز کر دیا گیا ہے جو قاری کو عام طور پر معلوم ہیں :

۱۔ پہلا ایڈیشن (۱۸۴۱ء)

غالب، میجر جان جاکوب بہادر (جان جیکب)[1] کو مطبع سید الاخبار کے بارے میں کچھ اطلاعات بہم پہنچاتے ہوئے ایک خط میں لکھتے ہیں :

"...... دیوان ریختہ کہ در ناتمامی تمام است عجب نیست کہ ہم دریں ماہ بہ تمامی وانگاہ بنظر گاہ سامی رسد......"

(ترجمہ : (میرا) دیوان اردو بھی جو باوجود ادھورا ہونے کے مکمل ہے عجب نہیں اسی مہینے میں (اسی مطبع سے) تمام ہو کر آپ کی نگاہِ عالی سے گزرے ....)

اس خط سے دو باتیں سامنے آتی ہیں۔ اوّل یہ کہ دیوان چھپ رہا ہے۔ دوم یہ کہ دیوان اگرچہ ادھورا ہے تاہم مکمل ہے یعنی منتخب ہے۔

سرورق کے مطابق، بالآخر، دیوان شعبان ۱۲۵۷ھ مطابق اکتوبر ۱۸۴۱ء میں[2] چھپ گیا۔ دیوان کے ص ۱۰۴ پر ایک رباعی درج ہے ؎

---

[1] پنج آہنگ، طبع اوّل ۱۸۴۹ء، ص ۳۰۸

[2] دیوان غالب نسخۂ عرشی، اشاعت دوم۔ مقدمہ ص ۱۱۰ (عرشی صاحب کا بیان جس کا یہ حوالہ ہے اگلے ص پر دیکھیے)

ہیں شہ میں صفاتِ ذوالجلالی باہم — آثارِ جلالی و جمالی باہم
ہوں شاد نہ کیوں اسفل و عالی باہم — ہے اب کے شبِ قدر و دوالی باہم

عرشی صاحب مرحوم اس رباعی کے پیشِ نظر لکھتے ہیں: (حوالہ گزشتہ صفحے کے حاشیے میں دیکھیے)۔

"..... شعبان ۱۲۵۷ھ (اکتوبر ۱۸۴۱ء) میں میرزا صاحب کا دیوان اس مطبع (سید الاخبار) میں چھپنا شروع ہوا، اور ۲۷ رمضان (۱۲ نومبر) تک زیرِ طبع رہا۔ تاریخِ آغاز سرورق پر مذکور ہے، اور ۲۷ رمضان تک اختتام نہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس میں یہ رباعی بھی شامل ہے: ہے اب کے شبِ قدر و دوالی باہم۔ اور از روئے حساب دوالی اور شبِ قدر کا اجتماع اسی تاریخ کو ہوا تھا"

مگر یہ دونوں دلیلیں ضعیف ہیں۔ دیوان کے سرورق پر یہ کہیں نہیں لکھا گیا کہ اکتوبر ۱۸۴۱ء طباعتِ دیوان کی تاریخِ آغاز ہے۔ اگر تاریخِ آغاز کی نشاندہی منظور ہوتی تو دن کا ذکر بھی ہونا چاہیے تھا۔ اسی طرح رباعی سے یہ کہیں ظاہر نہیں ہوتا کہ شبِ قدر اور دیوالی کے اجتماع کی تاریخ گزر چکی ہے۔ اس میں صرف یہ بتایا گیا ہے کہ چھوٹے بڑے آپس میں اس لیے خوش (ہو کر گلے مل رہے) ہیں کہ اب کے شبِ قدر اور دیوالی بھی ایک ہی تاریخ کو باہم (بغل گیر ہونے والی) ہیں۔ رباعی یقیناً ۲۷ رمضان (۱۲ نومبر) سے پہلے کہی گئی ہوگی۔ ایسا ہونا اگر ناممکن نہیں تو دور از قیاس ضرور ہے کہ طباعت سے مہینوں پہلے مسودے کی کتابت کرائی گئی ہو اور طباعت کے دوران میں بیچ ایک رباعی کا اضافہ کر دیا گیا ہو۔ چھپے ہوئے دیوان میں یہ رباعی جس مقام پر ہے وہ ظاہر کرتا ہے کہ تمام مسودہ ایک ہی قلم سے سلسلہ وار لکھا گیا تھا۔

دیوان میں درج شعروں کی تفصیل یہ ہے۔

غزلیات کے اشعار	۹۹۸
۲ مصرعے جو غزل میں چھپنے سے رہ گئے مگر غلط نامہ میں موجود ہیں[1]	۱
قصیدوں، قطعوں، رباعیوں کے اشعار	۹۷
	۱۰۹۶

ص ۵۹ پر چھپے ہوئے ۳ شعر حقیقت میں اس قطعے[1] کے ہیں جو ص ۱۰۰ پر درج ہے اور دوبار شامل ہو گئے ہیں۔ اس طرح مجموعی تعدادِ اشعار ۱۰۹۳ رہ جاتی ہے۔ اب اگر معلوم ہو کہ یہ ۱۰۹۳ اشعار، کم از کم، ۲۹۵۴ اشعار سے منتخب کیے گئے ہیں[2] تو سمجھ میں آجاتا ہے کہ غالب نے اپنے "دیوانِ ریختہ" کو "در ناتمامی، تمام" کیوں کہا۔ ان کی مراد یہ ہے کہ دیوان صرف چھاپنے کی حد تک مکمل ہے حقیقت میں مکمل نہیں کیونکہ منتخب ہے۔

غالب کے دیوانِ ریختہ کے پانچوں ایڈیشنوں میں ان کا فارسی میں لکھا ہوا دیباچہ شامل ہے مگر اس پر تاریخِ تحریر درج نہیں ہے۔ دیوانِ غالب (نظامی بدایونی طبع ثانی)[3] میں پہلی بار یہ تاریخ درج کی گئی ہے۔ نظامی اپنے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

"اس مرتبہ اس سے بھی زیادہ پرانا ایک قلمی نسخہ ہاتھ آیا جو اصل دیوان سے نقل کیا گیا ہے جس کو پہلی مرتبہ غالب نے ۱۲۴۸ھ میں مرتب کیا تھا۔ یہ نقل جو ہمیں دستیاب ہوئی ہے اسی زمانے کی

---

[1] دیوانِ غالب ص ۱۹۔ غزل کا پہلا مصرعہ یہ ہے "یک ذرۂ زمیں نہیں بے کار باغ کا"

[1] "کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہمنشیں" معلوم ہوتا ہے اس شعر کو قطعے سے الگ کر کے، باقی تین شعروں کو غالب نے عمداً غزلوں میں بیٹھا دیا تھا۔ بعد میں مکمل قطعہ بھی شامل کر لیا مگر غزلوں میں سے تین شعر خارج کرنا بھول گئے۔ بعد کے ایڈیشنوں میں یہ غلطی درست کر دی گئی۔

[2] دیکھیے میرے مرتبہ "دیوانِ غالب (کامل) تاریخی ترتیب سے" میں ۱۸۰۷ء سے ۱۸۳۳ء تک کے اشعار۔

[3] اردو دیوانِ غالب مع شرح نظامی، مطبوعہ نظامی پریس بدایوں ۱۹۲۳ء ص ۵۰ اور متنِ غالب سے ایک صفحہ پہلے۔

لکھی ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ ایک دیباچہ بہ زبانِ فارسی مصنّف
نے لکھا ہے کہ جس کو ناظرین کے مطالعے کے لیے اس دیوان کے
شروع میں بجنسہٖ درج کیا گیا ہے ....[۱]

اس ایڈیشن میں غالب کے دیباچے کا عنوان اس طرح قائم کیا ہے
"دیباچہ جو خود مصنّف نے وقتِ ترتیبِ دیوانِ ہذا بہ زبانِ فارسی
لکھا"

آخر میں تاریخِ دیباچہ اس طرح درج کی ہے:
"بست و چہارم بشہر ذی قعدہ ۱۲۴۸ھ"

جو مطابق ہے ۱۶ اپریل ۱۸۳۳ء کے۔

نظامی مرحوم کو وہ دیوان جس میں یہ دیباچہ مع تاریخِ تحریر درج ہے کہاں سے ملا تھا؟ اس کی وضاحت میں ڈاکٹر سید عبداللطیف کی کتاب میں شایع شدہ ایک خط کے ذریعے ملتی ہے جو نظامی مرحوم نے سر اکبر حیدری کے نام ۳ دسمبر ۱۹۲۷ء کو لکھا تھا۔[۲] نظامی فرماتے ہیں:

"قلمی دیوان جو ۱۲۴۸ھ کے قریب کا لکھا ہوا مجھے ۱۹۱۸ء میں ملا
تھا اور جس کا ذکر میں نے اپنے یہاں کے مطبوعہ دیوانِ غالب کے
دوسرے ایڈیشن میں کیا ہے ...... ایک مرحوم دوست
(منشی احمد علی صاحب شوق) کے ذریعے سے مجھے رام پور میں دستیاب
ہوا تھا ...."

۱۔ اردو دیوانِ غالب مع شرحِ نظامی۔ مطبوعہ نظامی پریس بدایوں۔ ۱۹۲۳ء ص ۵۷ اور متنِ دیوانِ غالب سے ایک صفحہ پہلے۔

۲۔ غالب از ڈاکٹر سید عبداللطیف (انگریزی سے ترجمہ) مطبوعہ حیدرآباد۔ ۱۹۳۲ء ص ۱۳۵

چند لفظی ترامیم[1] سے قطعِ نظر، نظامی بدایونی کا نقل کردہ دیباچہ وہی ہے جو آٹھ سال
کے بعد (۱۸۴۱ء) سے شایع ہونے والے پانچوں ایڈیشنوں میں شامل ہے۔ اس سے یہ ثابت
ہوگیا کہ دیوانِ غالب لگ بھگ ۱۸۳۳ء کے پہلے ۳ ماہ میں طباعت کے لیے تیار ہوگیا تھا۔
اب ۱۶ اپریل ۱۸۳۳ء کو اس کا دیباچہ لکھ کر اسے کاتب کے حوالے کرنا تھا مگر ایسا نہیں
ہوا۔ دیباچہ تو لکھا گیا مگر مسودہ کاتب کے حوالے نہیں کیا گیا شاید اس لیے کہ ابھی نواب
ضیاالدین احمد خان نیّر و رخشاں نے اس کی تقریظ مکمل نہیں کی تھی۔ یہ تقریظ ۱۲۵۴ھ
(۲۸ مارچ ۱۸۳۸ء تا ۱۷ مارچ ۱۸۳۹ء) میں مکمل ہوئی۔ اس وقت اس میں غزل، قصیدہ، قطعہ
رباعی ملا کر کل اشعار "یک ہزار و ہفتاد و اند" تھے[2] یعنی ۱۰۷۰ سے کچھ اوپر (۱، ۲، ۳ سے ۹ تک
کچھ بھی)۔ لیکن جب دیوان، دیباچہ و تقریظ کے ساتھ چھپنے کے لیے دیا گیا تو اس میں جیسا کہ
پہلے بتایا جا چکا ہے، ۱۰۹۶ اشعار[4] چھپے۔ حقیقت یہ ہے کہ ۱۸۳۳ء تک دیوان کے
اشعار ۱۰۷۱ تھے[5]۔ بعد میں ۲۵ اشعار کا اضافہ ہوا[6]۔

---

۱ مثلاً طباعت کے وقت 'در خاکسترِ خویش' کو 'بہ خاکسترِ خویش'، 'کم مایہ' کو 'اندک مایہ' بنا دیا گیا ہے۔

۲ آثار الصنادید۔ مطبوعہ نولکشور جون ۱۸۷۶ء باب چوتھا ص ۸۵ "سنہ مقدسہ ہجریہ نبویہ ..... یک ہزار و دویست و پنجہ و چار ....."

۳ ایضاً ایضاً ایضاً ۸۶

۴ دیوانِ غالب (پہلا ایڈیشن) تقریظ میں تعدادِ اشعار "ہزار و نود و ہشت اند" لکھا ہے، جو غلط ہے۔

۵ ۶ دیکھیے میرے مرتبہ "دیوانِ غالب (کامل) تاریخی ترتیب سے" میں ۱۸۰۷ء سے ۱۸۴۱ء تک کے تم نشان والے اشعار۔

یہ ۲۷ شعروں میں سے لیے گئے تھے۔ تقریظ مشمولۂ دیوان مطبوعہ میں لفظی تغیر و تبدل بھی ہوا، اور مختلف ایڈیشنوں میں سنین اور تعدادِ اشعار میں ترامیم بھی ہوئیں۔

۱۸۳۳ء کے بعد جن ۲۵ اشعار کا اضافہ ہوا وہ یہ ہیں۔

دیوانِ غالب ص ۵۳	دی سادگی سے جان پڑوں کوہکن کے پانو[2]	۹ شعر نسخۂ بدایوں ۱۸۳۸ء	
ص ۵۸	تاہم کو شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا	۲ شعر حاشیہ ایضاً بعد از ۱۸۳۸ء	
ص ۶۵	زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب	۱ شعر گلشن بے خار، اپریل ۱۸۳۵ء	
ص ۸۴	ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے	۳ شعر نسخۂ بدایوں، حاشیہ بعد از ۱۸۳۸ء	
ص ۸۶	لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور؟ لاغر اتنا ہوں کہ گر تو بزم میں جا دے مجھے	۴ شعر۔ ایضاً۔	
ص ۱۰۰	گئے وہ دن کہ نادانستہ غیروں کی وفاداری	۲ شعر۔ ایضاً۔	
ص ۱۰۴	بھیجی ہے جو مجھ کو شاہِ جمجاہ نے دال	۲ شعر۔ ایضاً۔	
ص ۱۴۱	ہیں شہ میں صفاتِ ذوالجلالی باہم	۲ شعر شب قدر و دوالی باہم ۱۸۴۱ء	
		۲۵ شعر	

---

[2] ایک شعر کی ترمیم دلچسپ ہے۔ تقریظ میں شامل مثنوی کا تیسرا شعر آثار الصنادید میں اس طرح ہے
"نہیں فرزند نہ آبائے علوی، نہیں شاگردِ روح القدس عالی" اس کے مصرعِ ثانی کو دیوانِ غالب (پہلا ایڈیشن) میں یوں کر دیا ہے "دم روح القدس در کشفِ معنی"، پھر بعد کے ایڈیشنوں میں یہ شکل دے دی ہے "نہیں شاگردِ عقلِ کل عالی"

۲۔ بے چارہ کتنی دور سے آیا ہے شیخ جی
کعبے میں کیوں دبائیں نہ ہم برہمن کے پانو
یہ شعر بعد میں متداول دیوانِ غالب سے خارج کر دیا گیا تھا۔ اس طرح اب متداول دیوان میں اس غزل کے ۹ کے بجائے ۸ شعر شامل ہیں۔

مندرجہ بالا سے یہ نتائج برآمد ہوئے ہیں

۱۔ دیوانِ غالب، اولیں طباعت کے لیے لگ بھگ ۱۸۳۳ء کے پہلے سہ ماہے تک مکمل ہو چکا تھا۔

۲۔ اس میں ۱۰۷۱ اشعار تھے۔

[میرے ترتیب دیے ہوئے "دیوانِ غالب (کامل) تاریخی ترتیب سے" کے بابِ تعارف میں ۱۸۳۳ء تک متداول دیوان کے لیے منتخب اشعار کی تعداد ۱۰۷۳ آتی ہے۔ تاہم دیوانِ غالب پہلے ایڈیشن (۱۸۴۱ء) میں ۱۸۳۳ء تک ۱۰۷۱ اشعار ہی شامل کیے گئے تھے۔ "جمع خرچ" کی تفصیل ملاحظہ کیجیے۔

- ۱۸۳۳ء تک دیوان کے لیے منتخب اشعار — ۱۰۷۳
- متداول دیوان میں قصیدہ "ساز یک ذرہ ......" کے ۲۸ شعر ہیں
  مگر پہلے ایڈیشن سے ۳ شعر محذوف ہیں — ۳- / ۱۰۷۰
- خون ہے دل خاک میں احوالِ بتاں پر یعنی
  ان کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد
- یہ شعر پہلے ایڈیشن (ص ۲۹/۳۰) میں نہیں — ۱- / ۱۰۶۹
- سیاہی جیسے گر جائے دمِ تحریر کاغذ پر
  مری قسمت میں یوں تصویر ہے شبہائے ہجراں کی

  محابا کیا ہے، میں ضامن ادھر دیکھ
  شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا
- یہ دو شعر بھی پہلے ایڈیشن میں نہیں — ۲- / ۱۰۶۷
- ہو کر شہید عشق میں پائے ہزار جسم
  ہر موجِ گردِ راہ مرے سر کو دوش ہے
- یہ شعر پہلے ایڈیشن (ص ۷۲) میں ہے بعد میں حذف ہوا — ۱+ / ۱۰۶۸
- قطعے کے شعر جو پہلے ایڈیشن میں ص ۵۹ اور ص ۱۰۰ پر دوبارہ چھپ گئے "کلکتے کا جو ذکر ......"
  میزان — ۳+ / ۱۰۷۱

HaSnain Sialvi

۳) یہ اشعار ۲۹۵۴ اشعار میں سے منتخب ہوئے تھے۔ (بعد میں ۱۸۴۱ء تک کے فکر کردہ ۲۷ اشعار میں سے ۲۵ شعر مزید منتخب ہوئے۔ اِن ۲۷ شعروں کے اضافے سے اس وقت تک کے کہے ہوئے اشعار کی تعداد ۲۹۸۱ ہوگئی)

۴) اس کا دیباچہ غالب نے ۱۶ اپریل ۱۸۳۳ء کو ختم کیا۔

۵) تقریظ نواب ضیاالدّین احمد خاں نیّر درخشاں نے ۲۸ مارچ ۱۸۳۸ء اور ۱۷ مارچ ۱۸۳۹ء کے درمیان کسی وقت لکھی۔ قیاسِ غالب یہی ہے کہ ۱۸۳۸ء ہی میں لکھی۔

۶) طباعتِ دیوان کے وقت اس میں ۲۵ اشعار کا اضافہ ہوا اور کل شعر ۱۰۹۶ ہوگئے۔ (کاتب نے ایک غزل کے دو مصرعے حذف کردیے تھے جس کی وضاحت "غلط نامہ" میں موجود ہے۔ اس طرح اشعار جو متن میں درج ہیں، شمار میں ۱۰۹۵ ہیں مگر حقیقت میں ۱۰۹۶ ہیں۔ ۳ شعر دوبار درج ہوئے، وہ کم کیے تو دیوان کا مواد ۱۰۹۳ اشعار پر مشتمل رہ گیا)

۷) دیوان اکتوبر ۱۸۴۱ء کو "دہلی میں سید محمد خاں بہادر کے چھاپہ خانہ" (مطبع سید الاخبار) میں چھپا۔

دیوانِ غالب (طبع اوّل) بہت کم یاب ہے۔ جناب مالک رام فرماتے ہیں:[1]

"ایک کرم خوردہ نسخہ منشی مہیش پرشاد مرحوم کے پاس تھا۔ خدا معلوم اب کہاں ہے۔ خاں بہادر سید ابو محمد مرحوم کا نسخہ آزاد لائبریری، علی گڑھ میں آگیا ہے۔ ایک مکمل نسخہ صولت پبلک لائبریری، رامپور میں اور دوسرا جامعہ ملیہ اسلامیہ (دلّی) کے کتب خانے میں ہے"

جناب عرشی مرحوم، صولت پبلک لائبریری، رام پور کے نسخے کے بارے میں لکھتے ہیں:[2]

"سرورق کی پہلی سطر کے آخر میں لفظِ تخلّص کے اوپر سید محمد خاں کے دستخط ہیں"

---

[1] ذکرِ غالب۔ طبع پنجم ص ۱۶۶ ۔ [2] دیوان غالب نسخۂ عرشی ص ۱۲۸۔ مقدمہ

[2] دیوانِ غالب نسخۂ عرشی ص ۱۲۸۔ مقدمہ

میرے کتب خانے میں اس ایڈیشن کے دو نسخے ہیں اور صولت پبلک لائبریری، رام پور والے نسخے کا عکس بھی ہے۔ جب تک میں نے عرشی صاحب کا بیان نہیں پڑھا تھا اور صولت پبلک لائبریری والے نسخے کا عکس نہیں دیکھا تھا، مجھے معلوم نہ تھا کہ سرورق کے لفظِ "تخلص" پر بے معنی سا نشان حقیقت میں سید محمد خاں کے دستخط ہیں۔ بہر حال مجھے یہ بتاتے ہوئے تعجب ہوتا ہے کہ میرے دو نسخوں میں سے ایک پر بھی دستخط بعینہٖ اسی جگہ موجود ہیں۔ معلوم ہوتا ہے سید محمد خاں نے اس دیوان کے بعض مطبوعہ نسخوں پر دستخط کیے تھے سب پر نہیں۔

دیوان ۱۰۹ صفحوں کو محیط ہے۔ پہلا صفحہ سرورق کا ہے۔ دوسرا صفحہ خالی ہے۔ صفحات میں ۹۲ کا عدد دو دفعہ آگیا ہے مگر ص ۱۰۳ کے بعد ص ۱۰۴ چھوٹ گیا ہے، اس طرح پلڑے برابر ہو گئے ہیں۔

یہ ایڈیشن نہایت کم یاب تھا اس لیے ۱۹۸۶ء میں میں نے اس کا عکسی ایڈیشن شایع کر کے اسے عام کر دیا ہے[۱]۔

۲۔ دوسرا ایڈیشن (۱۸۴۷ء)

جناب عرشی مرحوم دیوانِ غالب اردو (پہلی بار ۱۹۵۸ء ص ۷۰ دیباچہ) میں دوسرے ایڈیشن کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> "نیّر کی تقریظ میں تاریخ ۱۲۵۴ھ ہی ہے مگر اشعار کی تعداد "یک ہزار و یک صد و اند" بنا دی گئی ہے گویا چھ برس کے اندر میرزا صاحب نے اردو کے کل چودہ شعر کہے تھے جو اس نسخے میں بڑھا دیے گئے۔ دونوں

۱۔ میں نے "دیوانِ غالب (عکسی۔ مطبوعہ ۱۸۴۱ء)" یعنی دیوانِ غالب کے پہلے ایڈیشن کو شایع کرتے وقت جو پیش لفظ لکھا تھا اس کے ص (ر) پر نئی معلومات کی روشنی میں اعداد و شمار کی حد تک کچھ رد و بدل کیا ہے۔ اس لیے ان سے، جن کے پاس میرا شایع کردہ ایڈیشن کا نسخہ ہو، گزارش ہے کہ وہ اس دیباچے کے پیشِ نظر اپنے نسخے میں ترمیم کر لیں۔

ایڈیشنوں (پہلے اور دوسرے) کے مقابلے سے معلوم ہوتا ہے کہ
صرف نواب تجمل حسین خاں کی مدحیہ غزل کا اضافہ ہوا ہے جس کے
۱۴ شعر ہیں۔"

اس سے پہلے ص ۹۶ پر عرشی صاحب کہہ چکے تھے کہ پہلے ایڈیشن میں کل ۱۰۹۸ یا (۳ شعر جو دوبار چھپ گئے ہیں کم کر کے) ۱۰۹۵ شعر ہیں۔ اس طرح دوسرے ایڈیشن میں (۱۴+۱۰۹۸) ۱۱۱۲ یا (۱۴+۱۰۹۵) ۱۱۰۹ شعر ہوئے۔

پھر اسی دیوان کی اشاعت دوم (۱۹۸۲ء۔ ص ۱۳۲ مقدمہ) میں وہی بات دہراتے ہیں۔ صرف یہ ترمیم کرتے ہیں کہ "چودہ شعر" کی جگہ "سولہ شعر" بنا دیتے ہیں۔ جس کا سبب بیسنی روٹی والا دو شعر کا قطعہ ہے جو پہلے ان سے گنتی میں چھوٹ گیا تھا۔ پہلے ایڈیشن کے اشعار کے شمار میں جو سہو ہو گیا تھا وہ بھی دیباچے کے ص ۱۳۱ پر درست کر لیا گیا ہے۔ اب شعر ۱۰۹۶ یا (۳ شعر کم کر کے) ۱۰۹۳ دیے گئے ہیں۔ جو قطعی درست ہے۔ مگر عرشی صاحب کی اس ترمیم کے باوجود دوسرے ایڈیشن میں اب بھی تعدادِ اشعار وہی رہی یعنی (۱۶+۱۰۹۶) ۱۱۱۲ یا (۱۶+۱۰۹۳) ۱۱۰۹ شعر۔

جناب مالک رام بھی دیوانِ غالب (تاریخ اشاعت فروری ۱۹۶۹ء) کے ص ۷ پر "تعارف" میں دوسرے ایڈیشن کی تعدادِ اشعار ۱۱۱۱ بتاتے ہیں۔ پھر دیوانِ غالب صدی ایڈیشن (جو ظاہر ہے ۱۹۶۹ء ہی کی تالیف ہے) کے ص ۱۹ پر رقم طراز ہیں۔

"اس نسخے میں (۱۱۱۱) شعر ہیں، یعنی طبع اوّل سے ۱۶ زیادہ: ایک تو وہی بیسنی روٹی والا دو شعروں کا قطعہ ہے۔ دوسری "جاں کے لیے" کی زمین کی آخری غزل، جس میں نواب تجمل حسین خاں کی مدح کا قطعہ ملتا ہے۔ اس میں چودہ شعر ہیں ———"

اس سے پہلے ص ۱۶ پر جناب مالک رام بھی پہلے ایڈیشن میں (۳-۱۰۹۸) ۱۰۹۵ اشعار ہی بتاتے ہیں۔ اس طرح اس تعداد میں ۱۶ اشعار کا اضافہ کر کے میزان (۱۱۱۱) ہو جاتی ہے۔ ۱۹۸۵ء میں بھی جناب مالک رام "گفتارِ غالب" (ص ۱۶۷ اور ص ۱۶۹) میں یہی بات دہراتے ہیں۔

عرشی صاحب نے دیوانِ غالب کی دونوں اشاعتوں میں دعوا کیا ہے کہ وہ دیوانِ غالب کے ۱۸۴۱ء اور ۱۸۴۷ء کے ایڈیشنوں کے مقابلے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ دوسرے ایڈیشن (۱۸۴۷ء) کی تعدادِ اشعار ۱۱۱۲ یا ۱۱۰۹ ہے۔ یعنی پہلے ایڈیشن کے تمام ۱۰۹۶ یا ۱۰۹۳ اشعار اور ۱۶ مزید اشعار مل کر دوسرے ایڈیشن کا کُل اثاثہ بنتے ہیں۔ وہ حیرت کا اظہار کرتے ہیں کہ "چھے برس کے اندر میرزا صاحب نے اردو کے کل سولہ شعر کہے تھے۔"

عرشی صاحب معتبر ترین محققوں میں شمار کیے جاتے ہیں اس لیے جنابِ مالک رام نے عرشی صاحب کے دعوے کو من وعن تسلیم کر لیا مگر حیرت اس بات پر ہے کہ عرشی صاحب دونوں ایڈیشنوں کا مقابلہ کرنے میں اتنی بڑی چوک کیونکر کر گئے۔

اب حقیقتِ حال ملاحظہ فرمائیے

- پہلے ایڈیشن کے کُل شعر — ۱۰۹۶
- "کلکتہ کا جو ذکر۔۔۔" والے قطعے کے شعر جو سہواً دو بار چھپ گئے — ۳
  ۱۰۹۳
- یہ ۲ شعر پہلے ایڈیشن میں ہیں مگر دوسرے میں نہیں

دل لگی ہے یار کی صفِ مژگاں سے روکشی
حالانکہ طاقتِ خلشِ خار بھی نہیں (ص ۹۴)

بے چارہ کتنی دور سے آیا ہے شیخ جی
کعبے میں کیوں دبائیں نہ ہم برہمن کے پانو (۵۳)

۲
۱۰۹۱

گویا دوسرے ایڈیشن میں پہلے ایڈیشن کے ۱۰۹۶ نہیں بلکہ ۱۰۹۱ اشعار ضم ہوئے۔

اب دیکھنا چاہیے کہ دوسرے ایڈیشن میں نئے شعر کتنے لیے گئے۔

- قطعہ: نہ پوچھ اس کی حقیقت ..... بیسن کی روغنی روٹی — ۲
- غزل: نویدِ امن ہے بیدادِ دوست، جاں کے لیے — ۱۴

- غزل ؎ کی وفا ہم سے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں — ۹
- 〃 ؎ ہم پر جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں — ۱۲
- 〃 ؎ ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں — ۱۳
- 〃 ؎ کل کے لیے کر آج نہ خسّت شراب میں — ۱۱
- پہلا ایڈیشن ص ۲۵۔ غزل ایک شعر کا اضافہ ہوا
  ؎ محابا کیا ہے، میں ضامن، ادھر دیکھ
  شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا! — ۱
- پہلا ایڈیشن ص ۲۹۔ غزل میں ایک شعر کا اضافہ
  ؎ خوں لہے دل خاک میں احوالِ بتاں پر یعنی
  ان کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد — ۱
- یہ شعر دیوان میں بڑھایا گیا ؎
  سیاہی جیسے گر جاوے دمِ تحریر کاغذ پر
  مری قسمت میں یوں تصویر ہے شبہائے ہجراں کی — ۱
  (دوسرے ایڈیشن میں سہواً "ہجراں" کی جگہ "بیجاں" چھپ گیا ہے)
- پہلا ایڈیشن ص ۹۵ "منتخب قصیدہ منقبت علی مرتضیٰ علیہ السلام"۔ اس سے ۳ شعر حذف کر دیے گئے تھے اب وہ دوسرے ایڈیشن میں بحال کر دیے گئے ہیں۔ محذوف اشعار کے شروع کے لفظ یہ ہیں (۱) وہ شہنشاہ (۲) فلک العرش (۳) سبزۂ نہ چمن — ۳

میزانِ اشعارِ نوجو داخلِ دیوان ہوئے	۶۷
میزانِ اشعار (پہلا ایڈیشن)	۱۰۹۱
دیوانِ غالب (دوسرا ایڈیشن) کے کل اشعار	۱۱۵۸

کل صفحات ۹۸ ہیں۔ دیوان "بہ تصحیح و مقابلہ جناب صدر المدح (یعنی مرزا اسد اللہ خاں بہادر المتخلص بغالب و اسد) در مطبع دار السلام واقع محلہ حوض قاضی بسنیہ اقل العباد عنایت حسین در ماہ مئی ۱۸۴۷ء باہتمام نور الدین لکھنوی" طبع ہوا۔

مطبع دار السلام کو مطبع صادق الاخبار بھی کہتے تھے کیونکہ اس نام کا ایک اخبار اس میں چھپتا تھا۔ اسی مطبع سے ۱۸۴۵ء میں مرزا کا دیوانِ فارسی کا پہلا ایڈیشن چھپ کر شائع ہو چکا تھا۔

۳۔ تیسرا ایڈیشن (۱۸۶۱ء)

دیوانِ غالب کا یہ ایڈیشن ۲۰ محرم ۱۲۷۸ھ (۲۹ جولائی ۱۸۶۱ء) کو "مطبع احمدی میں واقع دہلی امو جان کے اہتمام سے ..... مطبوع ہوا۔" یہ دیوان بہت غلط چھپا۔ چنانچہ غالب اپنے خط مورخہ ۱۸ اگست ۱۸۶۱ء بنام میر مہدی مجروح، لکھتے ہیں:

> "دیوانِ اردو چھپ چکا۔ ہائے لکھنؤ کے چھاپے خانے نے جس کا دیوان چھاپا، اس کو آسمان پر چڑھا دیا..... دلی پر اور اس کے پانی پر اور اس کے چھاپے پر لعنت! صاحبِ دیوان کو اس طرح یاد کرنا جیسے کوئی کتے کو آواز دے۔ بہر حال نہ میں خوش ہوا ہوں، نہ تم خوش ہو گے۔
> .... مطبعِ احمدی کے مالک محمد حسین خاں، مہتمم مرزا امو جان، مطبع شاہدرے میں، محمد حسین خاں، دلی شہر دانے مان کے کوچے میں، مصوروں کی حویلی کے پاس، قیمتِ کتاب ۶ آنے، محصولِ ڈاک خریدار کے ذمے ________"

اس ایڈیشن میں ۱۷۹۶ اشعار ہیں، گویا ۱۸۴۷ء تا ۱۸۶۱ء، غالب نے ۶۳۸ اشعار مزید منتخب کر کے اس میں شامل کیے۔ یہ وقفہ ۱۴ سال کا ہوا، مگر حقیقت اس کے برعکس ہے کیونکہ یہ تمام (۶۳۸) اشعار اُن اشعار میں سے منتخب ہوئے ہیں جو،

۱۸۴۷ء کے بعد اور ۱۸۵۵ء کے درمیانی عرصے یعنی ۸ سال میں کہے گئے۔ اس کی تفصیل میرے مرتب کیے ہوئے "دیوانِ غالب (کامل) تاریخی ترتیب سے" میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

۴۔ چوتھا ایڈیشن (۱۸۶۲ء)

غالبؔ، تیسرے ایڈیشن سے غیر مطمئن تو تھے ہی چنانچہ انھوں نے اس ایڈیشن کے ایک نسخے کو اپنے ہاتھ سے "دو رات دن کی محنت میں" صحیح کیا[1] اور محمد حسین خاں مالک مطبعِ احمدی دہلی کے سپرد کیا تاکہ وہ اب ایک طرح کے اس نئے مسودے کو، کیونکہ اس میں ۹ شعر کا اضافہ بھی کر دیا تھا، کسی دوسرے چھاپے خانے سے طبع کرا دیں۔ چنانچہ چوتھے ایڈیشن کے ص ۱۰۴ پر "خاتمۃ الطبع" کے عنوان سے یہ تحریر درج ہے۔

> "بخدمتِ اربابِ سخن عرض کرتا ہے ...... محمد عبدالرحمٰن بن حاجی محمد روشن خاں ..... کہ اس سے پہلے دیوان ..... جناب نواب اسداللہ خاں غالبؔ کا دہلی میں چھپا، لیکن بسبب سہو و نسیان کے بعض مقام میں تغیر و تبدل ہوا ..... اس لیے جناب ..... محمد حسین خاں صاحب دہلوی نے، بعد نظرِ ثانی اور تصحیح جناب مصنف کی، ایک نسخہ میرے پاس بھیجا ..... میں نے ..... مطابق اس نسخے کے شہر ذی حجہ ۱۲۷۸ھ[2] (جون ۱۸۶۲ء) مطبع نظامی واقع شہر کانپور میں صحتِ تمام اور درستی کمال سے چھاپا ...."

مگر باوجود حزم و احتیاط کے دعوے کے کتاب میں متعدد غلطیاں راہ پا گئیں جن سے کئی مقامات پر املا اور مطلب میں الجھاؤ پیدا ہو گیا۔ جس سے ظاہر ہے کہ پروف اور کاپیاں ٹھیک سے نہیں دیکھی گئی تھیں۔ جیسے:

---

[1] یہ الگ ایک داستان ہے جو بہت جگہ دہرائی جا چکی ہے اس لیے یہاں اسے حذف کیا جاتا ہے۔

[2] ذی حجہ ۱۲۷۸ھ = ۳۱ مئی تا ۲۸ جون ۱۸۶۲ء

۔ خوناب کو ہر جگہ خونناب لکھا گیا ہے (ص ۷، ۱۱، ۲۰ وغیرہ)
۔ ننگ سجدے بجائے ننگ سجدہ (ص ۱۸)
۔ پہلو اندیشہ ۔ اصل پہلوے اندیشہ (ص ۸)
۔ حق ناسپاس بجائے حق ناشناس (ص ۴۶)
۔ پھر بھر رہا ہے ۔ بھر رہا ہوں ہونا چاہیے (ص ۸۲)
۔ گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری خوشامد سے ۔ مری جو شامت آئے کی جگہ (ص ۸۳)
۔ بھر کے بھیجیں ہیں ۔ بھیجے ہیں کی جگہ (ص ۹۳)
۔ میرے ایہام بجائے ابہام (ص ۹۵)
۔ قابلِ شکایت ہیں ۔ ستائش کی جگہ (ص ۹۸)

اس ایڈیشن میں وہ تمام (۱۷۹۶) شعر لیے گئے جو تیسرے ایڈیشن میں شامل تھے ۔ ان کے علاوہ ۶ شعروں کا اضافہ بھی کر دیا ۔ ۳ شعر ص ۷۷ پر درج ہیں ؎

بہت سہی غمِ گیتی شراب کم کیا ہے

جو ۱۸۵۸ء میں کہے گئے تھے اور ۷ اشعار کی ایک غزل سے انتخاب کیے گئے تھے، اور ۳ شعر ص ۲۷ پر ہیں ؎

کیونکر اس بت سے رکھوں جان عزیز

جو ۱۸۶۲ء میں کہے گئے تھے ۔ ان میں مطلع اور مقطع دونوں موجود ہیں معلوم ہوتا ہے کہ دیوان کے اس ایڈیشن کی اشاعت تک اس غزل کے یہی ۳ شعر تخلیق ہوئے ہونگے ۔ اس طرح اس ایڈیشن کے کل اشعار ۱۸۰۲ ہو گئے اور غالب کا یہی کلام، کلام متداول ہے ۔ اور آگے چل کر بطورِ متن اسی متداول کلام یعنی چوتھے (نظامی) ایڈیشن کا عکس پیش کیا گیا ہے ۔

۵ ۔ پانچواں ایڈیشن (۱۸۶۳ء)

یہ ایڈیشن محض سالِ اشاعت (۱۸۶۳ء) کی وجہ سے پانچواں ایڈیشن ہے ورنہ

حقیقت یہ ہے کہ اسے تیسرا یا چوتھا ایڈیشن کہنا چاہیے۔ کیونکہ اس کا مسودہ غالب نے ۵ جون ۱۸۶۰ء کو شیو نارائن کو بھیج دیا تھا اور تیسرے ایڈیشن (جولائی ۱۸۶۱ء) کے بعد اور (قیاس ہے کہ) دسمبر ۱۸۶۱ء تک، یہ چھپنا بھی شروع ہو چکا تھا جس کا ثبوت وہ خط ہے جو غالب نے شیو نراین آرام کو ۱۰ جنوری ۱۸۶۲ء کو معذرت نامے کے طور پر بھیجا تھا۔ اب جب کہ دیوانِ غالب کے پے درپے دو ایڈیشن (۱۸۶۱ء اور ۱۸۶۲ء) شایع ہو چکے تھے، منشی شیو نارائن (آرام تلمیذِ غالب) کے لیے سوائے اس کے کوئی راستہ نہ تھا کہ وہ اس دیوان کی اشاعت کو چندے اور روک لیتے۔ آخرِ کار یہ ایڈیشن ۱۸۶۳ء میں چھپا۔ سرورق کی عبارت یہ ہے:

"العلم قوة

دیوانِ غالب سنہ ۱۸۶۳ء

مطبع مفید خلائق آگرہ میں اہتمام سے منشی شیو نارائن کے چھپا"

اس میں ۱۷۹۵ شعر ہیں یعنی تیسرے ایڈیشن سے ایک شعر کم۔ وہ شعر یہ ہے ؎

مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر — عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو

اس ایڈیشن کو اعلیٰ طباعت اور جدید املا کے التزام کے سبب باقی سب ایڈیشنوں پر برتری حاصل ہے۔

××× ——— ×××

غالب کے متداول اردو کلام میں ۱۷۹۶ شعر وہ ہیں جو انھوں نے ۱۸۵۵ء تک کے کہے ہوئے اشعار سے منتخب کیے تھے۔ اس کے بعد دمِ آخر تک، انھوں نے مزید ۴۰۳ اشعار تخلیق کیے۔ ان میں سے ۶ شعر وہ جو ۱۸۶۲ء میں چھپے ہوئے دیوانِ غالب (چوتھا ایڈیشن۔ نظامی، کانپور) میں شامل کیے گئے اور ۱۳۳ شعر قادر نامے کے اور منہا کیجیے جو ۱۸۵۶ء میں مطبع سلطانی دہلی سے چھپا تھا۔ اس طرح باقی ۲۶۴ اشعار بچے جو غیر

۱؎ تفصیل کے لیے دیکھیے میرا مرتب کیا ہوا "دیوانِ غالب (کامل) تاریخی ترتیب سے"۔

مطبوعہ رہے ان کی تفصیل یہ ہے۔

۱۱ قطعے	۶۶ شعر
۴ قصیدے	۱۱۰
۵ غزلیں	۵۳
متفرق/غزلیات	۱۵
۳ رباعیاں	۶
مرثیہ	۹
مثنوی	۳
سہرا	۲
میزان	۲۶۴ شعر

اگر غالب چاہتے تو ۱۸۶۳ء کے بعد، اپنی آخری عمر میں ان ۲۶۴ اشعار میں سے مزید ۲۰۰ شعر منتخب کرکے، دو ہزار اشعار پر مشتمل اپنے اردو دیوان کا چھٹا (ساتواں؟) ایڈیشن بھی نکال سکتے تھے۔ لیکن تب دیوانِ اردو کے بجائے انھوں نے صرف اپنے دوسرے اردو فارسی کلام نظم و نثر کی طرف توجہ دی۔ چنانچہ مئی۔ جون ۱۸۶۳ء میں دیوانِ فارسی (کلیاتِ نظم فارسی) مطبع نولکشور لکھنؤ سے شایع ہوا۔ ۱۸۶۴ء میں مثنوی ابرِ گہر بار الگ سے اکمل المطابع دلی سے شایع ہوئی۔ اسی سال مجلس پریس دلی سے 'قادر نامہ' دوسری بار چھپا۔ اسی سال 'لطائفِ غیبی' ظہور میں آئی۔ ۱۸۶۵ء میں سوالاتِ عبدالکریم، اگست ۱۸۶۵ء میں 'نامۂ غالب'، اسی سال 'دستنبو' کا دوسرا ایڈیشن مطبع لٹریری سوسائٹی روہیل کھنڈ بریلی سے اور دسمبر ۱۸۶۵ء میں 'قاطع برہان' کی طبعِ ثانی بعنوان 'درفشِ کاویانی' کی اشاعت ہوئی۔ تقریباً ۱۸۶۷ء میں 'دعائے صباح' کا منظوم ترجمۂ فارسی مطبع نولکشور، لکھنؤ سے، اور فروری ۱۸۶۷ء میں نکاتِ غالب و رقعاتِ غالب مطبع سراجی دلی سے اور اگست ۱۸۶۷ء میں مطبع محمدی دلی سے 'سبدِ چین' چھپی۔ جنوری

۱۸۶۸ء میں مطبع نولکشور لکھنؤ سے "کلیاتِ نثرِ فارسی" اور ۲۷ اکتوبر ۱۸۶۸ء کو "عودِ ہندی" (مجموعۂ مکاتیبِ غالب) مطبع مجتبائی میرٹھ سے شائع ہوئی۔

بڑھاپا، برہانِ قاطع کا قضیہ، مقدمۂ ازالۂ حیثیتِ عرفی، مالی بدحالی، جیسی جان لیوا پریشانیاں اور اس پر کلام نظم و نثر فارسی و اردو کا یہ زبردست اشاعتی پروگرام اب یہ توقع رکھنا کہ وہ دیوانِ غالب اردو کا چھٹا (ساتواں ؟) ایڈیشن بھی شائع کرا دیتے ایسا ہی ہے جیسا کہ یہ تمنا کرنا کہ

ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

"نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ نواب محمد اسد اللہ بیگ خاں بہادر عرف میرزا نوشہ المتخلص باسد و غالب" نے ۱۵ فروری ۱۸۶۵ء روز دوشنبہ، دوپہر ڈھلے انتقال فرمایا ؎

"ہاتف نے کہا گنجِ معانی ہے تہِ خاک"

غالبؔ کی متنازعہ رباعی پر ایک نظر

دُکھ، جی کے پسند ہو گیا ہے غالبؔ
دل، رُک رُک کر بند ہو گیا ہے غالبؔ
واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں
سوتا، سوگند ہو گیا ہے غالبؔ

۱۔ اس رباعی کے بارے میں نظم طبا طبائی لکھتے ہیں :

"......رباعی کے دوسرے مصرع میں دو حرف وزنِ رباعی سے زائد ہو گئے ہیں، اور ناموزوں ہے، مختلف چھاپے کے سب نسخوں میں بھی اور جس نسخے کی کاپیاں خود مرحوم کی تصحیح کی ہوئی ہیں، اس میں بھی یہ مصرع اسی طرح ہے..........اب خیال کرو، غالبؔ سا موزوں طبع شخص اور ناموزوں کہہ جائے ......غرض کہ غالبؔ سے شاعر منفرد نے عمر بھر مشق کر کے

۱۔ سلسلے کے لیے" غالبیات : چند عنوانات" کالی داس گپتا رضا (۱۹۸۲ء) ص ۱۴۵ ملاحظہ کیجیے۔

بھی ان اوزان پر قابو نہ پایا اور وزن غیر طبعی ہونے کے سبب سے
دھوکا کھایا۔۔۔۔[1]

۲۔ مولانا امتیاز علی عرشیؔ مرحوم اپنی ایک فرد گذاشت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں[2] :

"۔۔۔۔۔۔مرزا صاحب کی ایک رباعی ۔۔۔۔۔۔۔ میں سے مولانا نظم
طباطبائی کے اعتراض کے تحت، میں نے ایک لفظ گرا کر مصرع یوں
چھاپا ہے :

دل رُک کر بند ہو گیا ہے غالبؔ !

فاضل محترم جناب منشی حامد علی خاں صاحب منشی فاضل (رام پور)
نے مجھے بتایا کہ یہاں رُک رُک، بہ تکرار درست ہے۔ کیوں کہ یہ مصرع
رباعی کے ۲۴ وزنوں میں سے ایک وزن پر پورا اترتا ہے اور یہ بات
از روئے قواعد عروض جائز ہے کہ رباعی کے چاروں مصرعوں کو ایک یا
زاید اوزانِ رباعی پر نظم کیا جائے۔ لہٰذا اربابِ ذوق متن (دیوانِ غالبؔ
نسخۂ عرشیؔ) میں تصحیح فرماکر شرحِ غالبؔ (ص ۲۸۰ نظم طباطبائی) کا نوٹ
کالعدم قرار دے لیں۔"

ظاہر ہے کہ دانشوروں نے عرشیؔ صاحب کو ان کی فرو گذاشت کی فروگذاشت
کا احساس دلایا ہوگا۔ چنانچہ عرشیؔ صاحب دیوانِ غالبؔ کی دوسری اشاعت
میں اپنے پہلے بیان کو کالعدم قرار دیتے ہوئے یوں رقم طراز ہوتے ہیں :

"اس رباعی کے دوسرے مصرع میں مرزا صاحب نے ازراہِ

۱۔ شرح دیوانِ اردو غالبؔ ۔ نظم حیدر طباطبائیؔ ۔ مطبع مفید الاسلام حیدرآباد مطبوعہ ۱۳۱۸ھ
(۱۹۰۰-۱۹۰۱ء) ص ۳۴۲۔

۲۔ دیوانِ غالبؔ اردو نسخۂ عرشیؔ : پہلی بار (۱۹۵۸ء) ص ۱۲۰۔

سہواً ایک رُکن بڑھا دیا ہے ۔ ملاحظہ ہو شرح طبا طبائی : ۳۶۲ ......[1]

قطع نظر اس کے کہ یہاں رُکن کی جگہ سببِ خفیف لکھنا زیادہ مناسب ہوتا، اس بات کی داد دینی ہوگی کہ عرشی صاحب نے یہاں بے کار کی تاویلوں میں اُلجھنے کے بجائے سیدھے سیدھے حق کا راستہ اختیار کیا ۔

۳۔ رسالہ اردو ادب میں علامہ سحر عشق آبادی مرحوم کا ایک مضمون 'غالب کی ایک رُباعی' چھپا تھا، جو اس رُباعی سے متعلق ہے ۔ سحر لکھتے ہیں[2] ۔

"غالب کی رباعی ہر شاعر کے لیے ایک پہیلی بنی ہوئی ہے جو جس کے سمجھ میں آتا ہے، لکھ دیتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مرزا نوشہ اس پر لوٹ لگانا چاہتے تھے، لیکن دوسرے مرزا دھر گوپال سہائے صاحب بھٹنا گر تفتہ سکندر آبادی) نے کہا کہ کچھ تو اوروں کو سمجھنے کے لیے چھوڑ دیجیے، کیا اتنی بات بھی اہلِ نظر نہ سمجھ سکیں گے ؟ مرزا نوشہ مسکرا کر خاموش ہو گئے ۔ آخر وہی ہوا جس کا مرزا نوشہ کو شبہہ تھا......"

آگے لکھتے ہیں :

" اب میں کہتا ہوں کہ رُباعی کا دوسرا مصرع ما بائی رے چوبیس اوزان میں ہے نہ جدید چھتیس اوزان میں ......"

پھر لکھتے ہیں :

"اس میں عروض کا جو نکتہ ہے وہ طبا طبائی سے پوشیدہ نہ تھا ۔ انھوں نے عمداً ظاہر نہ فرمایا، وہ چاہتے تو اب تک یہ مصرع معمّا نہ بنا رہتا ، آخر مجھے یہ معمّا حل کرنا ہے اور ضرور کروں گا ۔"

۱۔ دیوانِ غالب نسخۂ عرشی ، نقشِ ثانی (اشاعت دوم ۱۹۸۲ء) حاشیہ صفحہ ۳۴۰ ۔

۲۔ اردو ادب (شمارہ ۳ ۔ ۱۹۶۵ء) ، بحوالۂ غالبیات : چند عنوانات ص ۱۵۶ ۔

لیکن اس کے بعد سحر صاحب اور ہی باتوں میں اُلجھ گئے۔ گویا ہماری بدقسمتی سے یہ معما حل ہوتے ہوتے رہ گیا۔ اب ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ سحر صاحب کے ذہن میں کون سا حل موجود تھا۔ اس لیے فی الحال اس مسئلے کو نظر انداز کیے بغیر چارہ نہیں مگر سحر صاحب کی دو باتیں محلِ نظر ہیں۔ اوّل یہ کہ غالبؔ اور تفتہؔ نے گٹھ جوڑ کر کے یہ معلوم کرنا چاہا تھا کہ دوسرے مشاہیر بلحاظِ عروض کتنے پانی میں ہیں، دوم یہ کہ نظم طباطبائی جانتے تھے کہ اس غلط مصرع میں عروض کا کیا نکتہ پوشیدہ ہے اور انہوں نے عمداً اسے ظاہر نہیں کیا۔

جہاں تک نظم طباطبائی کا تعلق ہے نہ ان کے کسی بیان سے ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ کسی طرح بھی اس رُباعی (دوسرا مصرع) کو صحیح سمجھتے تھے۔ انہوں نے صاف لکھا ہے کہ رُباعی ناموزوں ہے اور یہ کہ غالبؔ نے "دھوکا کھایا"۔ اس لیے سحر صاحب کا بیان مفروضے کے سوا کچھ نہیں۔[۱]

اب مختصراً یہ دیکھنا ہے کہ خود غالبؔ اور تفتہؔ کا عروض میں کیا مرتبہ ہے اور کیا یہ واقعی عروض کی ان بلندیوں کو چھو سکتے تھے کہ اپنے معاصرین اور آنے والی نسلوں کو اپنی عروضی کرتب بازی سے صدیوں تک حیرت میں ڈالے رکھیں، صرف ایک ہی مثال کافی ہوگی۔ غالبؔ لکھتے ہیں :

> "میں بحرِ ہزج مسدس۔ مخبون میں ایک شعر تم کو لکھتا ہوں ...."
>
> "بابو برج موہن، سوائے اس بحر (ہزج) کے یا بحرِ رمل کے اور بحر میں نہیں آسکتا۔ وہ شعر میرا یہ ہے ؎
>
> برم بچوں نام بابو برج موہن ؎[۲]
>
> چکد خونِ دلِ ریش از لبِ من ؎"[۳]

۱۔ جہاں تک غالبؔ اور تفتہؔ سے منسوب بیانات ہیں۔ ان کی حیثیت افسانہ طرازی سے زیادہ نہیں۔

۲۔ خیال رہے کہ غالبؔ اور تفتہؔ نے بابو کو بروزن فعلن، برج کو بروزن فاع اور موہن کو بروزن فعلن رکھا ہے۔ اس لیے میں نے بھی انہیں وزنوں کو پیشِ نظر رکھا ہے۔

۳۔ اردوئے معلیٰ ۱۸۶۹ء ص ۵۶

غالبؔ نے یہ خط تفتہ کو ۳۰ اپریل ۱۸۵۸ء کو لکھا تھا۔ اس کے جواب میں تفتہ نے غالباً غالبؔ کے بیان کو چیلنج کرتے ہوئے ایک دوسرے وزن میں 'بابو برج موہن' کو کھپا دیا۔ تاہم وہ وزن غالبؔ کی بیان کردہ بحروں سے باہر نہیں تھا۔ چنانچہ غالبؔ ۲۴ مئی ۱۸۵۸ء کو لکھتے ہیں :

"وہ جو تم کہتے ہو کہ

حرف بابو برج موہن سے زنم

۔۔۔۔۔۔ جب تک کہ تم نے نہیں لکھا، میرے خیال میں بھی یہ بات نہ تھی۔ بہر حال بات وہی ہے، جو میں اوپر لکھ آیا ہوں ۔۔۔۔۔۔[۱]"

حقیقت یہ ہے کہ غالبؔ کا شعر ہزج مسدس محذوف میں ہے نہ کہ ہزج مسدس مخبون میں۔ غالبؔ نے مخبون غلط لکھا ہے کیوں کہ ہزج میں خبن نہیں آتا۔ خبن دوسرے حرفِ ساکن کے گرنے کا نام ہے۔ مفاعیلن میں دوسرا حرف متحرک ہے، اس لیے خبن کی گنجائش نہیں[۲]۔

اب رہا 'بابو برج موہن' کے بحرِ ہزج اور بحرِ رمل کے سوا کسی اور بحر میں نہ آسکنے کا غالبؔ کا دعویٰ، تو یہ غلط ہے۔ کیونکہ 'بابو برج موہن' ہزج اور رمل کے علاوہ بھی کئی بحروں میں آسکتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ اردو میں مصرع میں نے لگائے ہیں :

(۱) مضارع مثمن سالم — مفاعیلن فاعلاتن مفاعیلن فاعلاتن

(مصائب سے رنج و غم سے چھٹے بابو برج موہن)

(۲) سریع مسدس کسوف — مستفعلن مستفعلن مفعولن

(دنیا سے بابو برج موہن اُٹھے)

(۳) خفیف مسدس سالم — فاعلاتن مستفع لن فاعلاتن

(اب کہاں بابو برج موہن کا ثانی)

۱۔ اردوئے معلیٰ ۱۸۶۹ء ص ۱۶۰

۲۔ پوری بحث کے لیے دیکھیے : غالبیات چند عنوانات ۔ ص ۔ ۱۶

(۴) رجز مثمن سالم   مستفعلن مستفعلن مستفعلن مستفعلن

(افسوس بابو برج موہن آج دنیا سے گئے)

اب آپ پر ظاہر ہو گیا ہو گا کہ غالبؔ اور تفتہ صرف اتنا ہی عروض جانتے تھے جتنا کہ اُس زمانے کے عام کہنہ مشق شاعر اور ادیب۔ وہ عروض کے منتہی نہ تھے کہ کوئی ایسا کام کر سکتے جو دنیائے ادب کو حیرت میں ڈال دیتا۔ غالبؔ اعلیٰ درجے کا تخلیقی ذہن رکھتے تھے، اس کے مقابلے میں انہیں فنِ شعر میں پوری دسترس حاصل نہ تھی، کیوں کہ انہوں نے باقاعدہ اکتسابِ فن نہیں کیا تھا۔ مستعار کتابیں اور مقامی عالموں کی زبانی سُنی سنائی باتوں پر تکیہ کسی کو ماہرِ فن نہیں بنا سکتا۔ تاہم انہیں شاگردوں کے استفسار پر کچھ نہ کچھ کہنا ضرور ہوتا تھا۔ اس لیے غلطیوں کے مرتکب ہو جایا کرتے تھے۔

(۴) جناب حامد علی خاں تحریر فرماتے ہیں[1]:

"........ دل رُک کر بند ہو گیا، تو ایسا ہی مہمل ہے جیسا 'دل رُک کر رُک گیا، یا دل بند ہو کر بند ہو گیا'[2] غالبؔ نے دل رُک رُک کر کہا تھا، تو اس طرح ایک ایسے تدریجی عمل کی طرف بلیغ اشارہ کیا تھا، جو آخر کار حرکتِ قلب کے کاملاً بند ہو جانے کی تمہید بنا تھا اور جس کا ذکر کیے بغیر مصرع قطعاً بے کیف رہ جاتا ہے۔ عروض خواہ کچھ کہے رُک کر کو 'رُک رُک کر' کی جگہ نہیں دی جا سکتی ...."

۱۔ دیوانِ غالبؔ مرتبہ حامد علی خاں، مجلس یادگارِ غالبؔ لاہور۔ ۱۹۶۹ء ص ۲۲۸ حاشیہ

۲۔ غالبیات چند عنوانات ــــ ص ۱۵۴ بھی ملاحظہ کیجیے۔

۳۔ ڈاکٹر گیان چند نے 'غالبیات چند عنوانات' میں اس رباعی پر میری توضیح پڑھ کر یہ لکھا "میں نے بھی رموزِ غالبؔ میں ص ۵۰ پر (حامد علی خاں کی طرح) یہی بات لکھی ہے کہ 'دل رُک رُک کر بند ہو گیا ہے' وہی بات ہوئی جیسے دل بند ہو کر بند ہو گیا ہے۔ میری یہ تحریر نقوش کے غالب نمبر ۱۹۶۹ء میں چھپی تھی۔ کیا حامد علی خاں نے اسے دیکھنے کے بعد اپنا دیوان شائع کیا؟ بہر حال آپ کا نوٹ پڑھ کر پہلی بار اس مصرع کے معنی سمجھ میں آئے ......"

میں عرض کرتا ہوں کہ 'دل رُک رُک کر بند ہو گیا ہے غالبؔ'، میں یقیناً ایک سبب زائد ہے اور اسلوبِ کلام پر ایک نظر ڈال لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ غالبؔ نے 'رُک کر' نہیں بلکہ 'رُک رُک کر' ہی کہا ہوگا۔ جیسے ان کے یہ مصرعے :

ع : میں بھی رُک رُک کے نہ مرتا، جو زباں کے بدلے

ع : تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے

اور اس طرح اُن سے یقیناً عروضی سہو ہوا ہے، لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ انہوں نے 'دل رُک رُک بند ہو گیا ہے غالبؔ' کہا ہو۔ ان کے کلام میں ایسی مثالیں موجود ہیں جہاں انہوں نے 'کر' کو محذوف رکھا ہے۔ مثلاً :

ع : ہوش اڑتے ہیں مرے جلوۂ گل دیکھ، اسدؔ

ع : رُک گیا دیکھ روانی میری

دونوں جگہ 'دیکھ'، بطور فعل امر نہیں بلکہ 'دیکھ کر' کے معنوں میں آیا ہے۔ غالبؔ خود اس مصرع کی تشریح کرتے ہیں اور کہتے ہیں :

"۔۔۔۔ وہ میری طبع کی روانی دیکھ کر رُک گیا۔۔۔۔[1]"

گویا مصرع میں 'کر' کا حذف دانستہ کیا گیا ہے۔ حامد علی خاں صاحب کا یہ کہنا کہ دل کے رُک رُک کر بند ہو جانے سے غالبؔ کی مراد ایسے "تدریجی عمل" سے ہے "جو آخر کار حرکتِ قلب کے کاملاً بند ہو جانے کی" خبر دیتا ہے، غلط ہے۔ اگر اس مصرع سے یہ مطلب لیا جائے کہ ہوتے ہوتے دل کی حرکت کاملاً بند ہو گئی تو رباعی کے آخری دو مصرعے ۔

واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں

سونا سوگند ہو گیا ہے غالبؔ

قطعی بے کار ہو جاتے ہیں۔ موت کی ابدی نیند کے بعد رات کو نیند نہ آنے کی شکایت اور سونا

---

[1] ادبی خطوطِ غالب ۔ انوار المطابع لکھنؤ ۔ ۱۹۳۸ء ص ۱۳۳ ۔ خط بنام مولوی عبدالرزاق شاکر ۔

سوگند ہو جانا، بے ربط باتیں ہیں۔ مصرع کا مطلب صرف اتنا ہے کہ باربار کے رنج و الم سے دل گھُٹ کے رہ گیا ہے، اس مصرع میں حرکتِ قلب بند ہو جانے سے موت واقع ہونے کی طرف کوئی اشارہ نہیں ہے۔ غالبؔ کے زمانے میں یا اس سے پہلے اس محاورے کے وہی معنی لیے جاتے تھے، جو میں نے اوپر بیان کیے ہیں۔ مثلاً میر حسن ؎

توڑ رگ رگ کے دل کو نہ کر اپنے بند
نہ پہنچے کہیں تیرے جی کو گزند[1]

(۵) جناب شمس الرحمٰن فاروقی فرماتے ہیں :

"ایک یا ایک سے زیادہ حرف مصرع کے شروع میں زائد کرنا اور اسے تقطیع میں نہ شمار کرنا بھی فارسی میں زحاف خزم کے تحت موجود ہے۔ متاخرین نے اسے ترک کیا تو کیا ہوا، کتابی جواز تو ہے ہی، کیوں کہ محقق طوسیؔ نے بھی زحاف خزم کو منسوخ نہیں کیا۔۔۔[2]۔۔۔۔"

فاروقی صاحب نے اگرچہ واضح نہیں کیا کہ یہ بیان غالبؔ کی رباعی کے دوسرے مصرع کی تائید میں ہے، تاہم جناب زارؔ علامی نے یہی سمجھا ہے، وہ لکھتے ہیں[3] :

"شمس الرحمٰن فاروقی کا غالبؔ کے مصرع کے متعلق زحاف خزم کے حق میں بولنا ہرگز ان کے دماغ کی اُپج نہیں بلکہ خاتم العروض استاذی حضرت علامہ عشق آبادی آنجہانی سے سُنی سنائی بات ہے۔۔۔۔۔"

لیکن علامہ سحر عشق آبادی مرحوم نے بھی زحاف کہیں سے پڑھ کر ہی معلوم کیا ہوگا، کشف تو ہوا نہیں ہوگا۔ فاروقی صاحب پڑھے لکھے آدمی ہیں اور پڑھنے کا شوق رکھتے ہیں۔ کیا

۱۔ غالبیات چند عنوانات۔ ص ۱۵۶

۲۔ عروض، آہنگ اور بیان۔ شمس الرحمٰن فاروقی۔ ص ۲۷

۳۔ ماہنامہ شانِ ہند دہلی۔ اکتوبر ۱۹۸۲ء ص ۱۴ غالبؔ کی ایک متنازعہ رُباعی۔

انہوں نے سحر مرحوم کی طرح "معیار الاشعار" (محقق طوسی) یا اس کا ترجمہ اردو زرِ کامل عیار (اسیر لکھنوی مرحوم) نہیں پڑھا ہوگا؟ مجھ ایسے کم مطالعہ شخص نے یہ کتاب اوّل سے آخر تک ایک سے زیادہ بار پڑھی ہے [زرِ کامل عیار (اکتوبر ۱۹۰۵ء نول کشور کان پور بارِ اوّل) کا ایک نسخہ میرے کتب خانے میں موجود ہے، اقتباسات آگے آئیں گے] یہاں ایک دلچسپ واقعہ بیان کرتا ہوں۔ کوئی تیس برس پہلے کی بات ہے، میں نے 'فاعلاتن مفاعلن فعلن' کے وزن پر ایک قطعہ 'آزمائش' کے نام سے لکھا اور ہر مصرع کے شروع میں ایک حرف بڑھا دیا یہ بات محض ایک جدت پیدا کرنے کے خیال سے ذہن میں آئی تھی، کوئی اور مقصد نہ تھا۔ قطعہ استاذی قبلہ جوشؔ ملسیانی کو اصلاح کے لیے بھیجا انہوں نے بغیر اصلاح واپس کر دیا اور اس کے ساتھ حاشیے میں ایک نوٹ لگا کر ۱۲ جولائی ۱۹۵۳ء تاریخ ڈال دی، میں نوٹ بعد میں لکھوں گا، پہلے قطعہ دیکھ لیجیے :

آزمائش

جنون ہوں، جہل ہوں میں وحشت ہوں	مگر سبق دہر کو پڑھاتا ہوں
بنی جو ہو تو بگاڑ دوں سو بار	کسی کی بگڑی نہیں بناتا ہوں
حرام کو بھی حلال سمجھا ہے	حلال کو بھی حرام پاتا ہوں
جو نالے کرتے ہیں، آہیں بھرتے ہیں	میں اُن کی صورت پہ مسکراتا ہوں
شراب پیتا ہوں توبہ کر کر کے	بدل بدل کر کباب کھاتا ہوں
نہیں ہوں پابندِ حکمِ یزدانی	نمازیوں کو بھی منہ چڑاتا ہوں

۱۔ اصلاح کے علاوہ میں نے استاذی جوشؔ ملسیانی سے یہ دریافت کیا تھا کہ کیا اس طرح ہر مصرع کے شروع میں حرف بڑھا دینا جائز ہے؟ یہ نہیں پوچھا تھا کہ یہ کون سا وزن ہے؟

معاف گستاخیاں مری اے دوست! صحیح، لو بات اب بتاتا ہوں
فقط خدا کے رحیم ہونے کو
گناہ کر کر کے آزماتا ہوں

نوٹ یہ ہے :

"محض ارکان جمع کر دینے کا نام وزن نہیں ہے، عروض کی پابندی شرط ہے۔ کسی بھی وزن کے شروع میں حرف یا حروف زیادہ کرنا صدیوں سے متروک ہے۔ ایک تو اس کا کوئی جواز نہیں، دوسرے (شعر میں) مغایرت پیدا ہوتی ہے ...."

جوشؔ ملسیانی ۱۲ ۷/۵۲

"صدیوں سے متروک" سے مراد یقیناً محقق طوسی کا زمانہ (۱۲۰۰ء تا ۱۲۷۴ء) ہے یعنی سات صدیاں بیت چکی ہیں، کیا جوشؔ صاحب بھی خزم سے ناواقف تھے؟ انہوں نے دیوانِ غالبؔ کی شرح میں اس رباعی کے دوسرے مصرع کے لیے خزم سے کوئی استفادہ نہیں کیا۔ کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ اگر یہ زحاف منسوخ نہیں تو منسوخ کی حد تک متروک ہے۔

جناب زارؔ علامی صاحب آگے چل کر بغیر کسی ثبوت کے تقریباً وہی قصہ دہراتے ہیں جو مختصراً سحرؔ عشق آبادی مرحوم غالبؔ اور تفتہؔ کے تعلق سے پہلے لکھ چکے تھے اور جس کے من گھڑت ہونے میں شک نہیں ہے۔ انہوں نے اپنے استاد کی زبانی اتنا ضرور اضافہ کر دیا کہ :

"مرزا غالبؔ نے یہ رباعی ہر گوپال تفتہؔ کے کہنے پر بطور مثال تخلیق کی تھی اور بس .... یہاں ضرورتِ شعری کی بات بھی نہیں، غالبؔ اگر چاہتا تو اس رباعی کو حذف بھی کر سکتا تھا لیکن اس کا مدعا تو صرف 'خزم' کی مثال پیش کرنا تھا اور وہ بھی تفتہؔ کے کہنے پر۔ اب لوگ اس کو کچھ بھی رنگ دیں[1] ...."

---

[1] شانِ ہند دہلی۔ ص ۱۶ اکتوبر ۱۹۸۲ء

تحقیق میں کسی بات کو اپنی مرضی سے کوئی رنگ نہیں دیا جا سکتا۔ تحقیق بے رنگ ہوتی ہے یا کہیے کہ رنگِ حقیقی اس کا رنگ ہوتا ہے ۔۔۔ غالبؔ اگر چاہتا تو اس رُباعی کو حذف بھی کر سکتا تھا۔۔ یہ مگر وہ ایسا نہیں کر سکا کیوں کہ یہ رباعی غالبؔ کی بہترین رباعیوں میں سے ہے اور اس کی روانی ہی کی وجہ سے غالبؔ اور اس کے معاصرین اس کے دوسرے مصرعِ کی ناموزونی کو محسوس نہ کر سکے۔ غالبؔ نے اسے محض "خزم کی مثال پیش" کرنے کے لیے تخلیق نہیں کیا تھا، کیوں کہ خزم کی مثالیں پہلے سے موجود ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ غالبؔ، تفتہؔ، سحرؔ عشق آبادی اور زارؔ علامی، جیسے ماہرینِ عروض میں سے کسی نے معیار الاشعار یا زرِ کامل عیار ترجمہ معیار الاشعار کی فصل ہشتم، جو تغیّر زیادت کے بیان میں ہے، نہیں پڑھی، جس میں خزم کی ایک نہیں بلکہ سات مثالیں موجود ہیں، اور انہوں نے شاید یہ بھی نہیں پڑھا کہ سات سو برس پہلے بھی محقق طوسیؔ نے 'خزم' کو "نہایت گراں اور ناپسندیدہ" کہا ہے، اور یہ بھی کہا ہے کہ "متاخر البتہ استعمال خزم کا نہیں کرتے ہیں۔" اب غالبؔ کے ایسا غیر معمولی تخلیقی ذہن جو شعری علوم کی چھوٹی چھوٹی پیچیدگیوں سے گھبرا کر یہ تک کہنے پر مجبور ہو جائے کہ "ائمہ فن نے وہ کچھ لکھا ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا۔۔۔[1]" صدیوں کے پرانے عروض پر کیا حاوی ہو سکتا ہے اور صدیوں سے متروک، گراں اور ناپسندیدہ زحاف کو زندہ کرنے پر کیونکر کمربستہ ہو سکتا ہے۔

اب ذیل میں زرِ کامل عیار (اسیرؔ لکھنوی) ترجمہ معیار الاشعار (محقق طوسیؔ) (مطبوعہ نول کشور کان پور ۔۔۔ اکتوبر ۱۹۰۵ء بار اول) کی فصل ہشتم (ص ۲۲۲) کے اردو متن کا ضروری حصہ درج کیا جاتا ہے:

ص ۲۲۲ ۔۔۔۔۔۔ "فصل ہشتم، بیان تغیّر زیادت میں کہ ارکان سے تعلق نہیں رکھتا۔ پس تغیّرات جو پہلے بیان کیے، ہم نے ان میں ایک تغیّر بہ زیادت بھی ہے، اس کو خزم کہتے ہیں، کسی جگہ مثال اس کی نہیں

---

[1] خط بنام صاحب عالم۔ ادبی خطوطِ غالبؔ۔ انوار المطابع لکھنؤ ۱۹۳۸ء ص ۷۷

لاتے ہیں۔ وہ نہایت گراں اور ناپسندیدہ ہے اور کسی رکن اور کسی بحر
کے ساتھ خاص نہیں اور یہاں اس کو اس لیے بیان کیا ہے کہ جب تک
بحریں اور اوزان معلوم نہ ہوں، ادراک اس کا جیسا چاہیے، حاصل نہیں
ہوتا، اور خزم اکثر بہ یک حرف ہوتا ہے کہ اوّل بیت میں لاتے ہیں۔
........[(حاشیہ) خزم دراصل انداختن حلقہ در بینی شتر است]
......اور زیادہ ایک حرف سے بھی لائے ہیں، چار حرف تک یعنی
چار حرف کا کلمہ، اور بہت کم ہے اور مثال اس کی ... رقوم متن ہے
.... مثال زیادت دو حرف (ایک سبب خفیف) کی یہ ہے۔
شعر۔ قد فاق الیوم من حدیثک مالست مدرکہ۔۔ بروزن فاعلاتن
مفاعلن فعلاتن مفاعلن، خفیف مجزو ہے، اور قد خزم ہے ....
.....اور فارسی میں بہ یک حرف قدما لائے ہیں یعنی اوّل مصرع میں
.......اور بعضے اوّل مصرع دوم میں بھی لائے ہیں جیسا کہ مرآدی
نے کہا ہے۔

[از خشم و کنج پہ فریاد و سود
که مرگ کند بر تن تو ناختن]

...... بحر سریع ہے اور حرف کاف (کہ)، کا اوّل مصرع
دوم میں خزم ہے، اور متاخر البتہ استعمال خزم کا نہیں کرتے ہیں۔۔"

اسی فصل میں ذیل کی سات مثالوں کی نشان دہی کی جاتی ہے۔ اصل کے لیے کتاب سے
رجوع کریں۔ :

۱	مثال	امراالقیس	ص	۲۲۱	دکان ...	بحر طویل
۲	"	(حاشیہ)	"	۲۲۲	تاللہ	" بسیط
۳	"	(متن)	"	۲۲۲	اُشدد	" ہزج

۴	مثال	(متن)	ص	۲۲۳	قدفانتی	" خفیف
۵	"	"	"	۲۲۳	اذاحذرت	" مدید
۶	"	رودکی	"	۲۲۳	جعدانجون	" خفیف
۷	"	مرادی	"	۲۲۳	از خشم وگنج	" سریع

اِستدراک

اسیر لکھنوی نے اپنی کتاب شجرۃ العروض (نول کشور۔ نومبر ۱۸۷۳ء ص ۲۲) میں بھی خزم کا ذکر کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ معیار الاشعار ہی سے اخذ کیا ہے، لیکن مثالیں نہیں دیں۔ اقتباس حاضر ہے:

"خزم بالفتح وزا معجم۔ معنی لغوی۔ حلقہ در بینی شتر وغیرہ کردن۔ معنی اصلاحی اہلِ عروض۔ یک حرف یا دو یا سہ یا چہار حرف زیادہ کردن در اوّل مصراع کہ در تقطیع شمار نکنند و ایں مخصوص اشعار عرب است و در فارسی ہم قدما یک حرف آوردہ اند۔ استعمال متاخرین نیست[1]"

---

[1] علامہ سحر عشق آبادی مرحوم اور حضرت زار علامی کی بے راہ رویوں اور بے ادبیوں سے مجبور ہو کر میں نے ایک مبسوط اور مدلّل مضمون بعنوان 'خزم' ماہنامہ "اسباق" پونا کے ۱۹۹۰ء کے سالنامے میں لکھا ہے۔ شائقین ملاحظہ فرمائیں۔

غالبؔ کے ایک قطعے کی اوّلین شرح

قدرؔ بلگرامی شاگردِ غالبؔ (سید غلام حسنین قدرؔ بلگرامی ۔ اکتوبر ۱۸۳۳ء تا ستمبر ۱۸۸۴ء) تقریباً ساری عمر مدرس رہے ۔ آخری تقرر بطور مدرس کیننگ کالج لکھنؤ میں ہوا ۔ یہ ملازمت وسط ۱۸۷۶ء سے دسمبر ۱۸۸۳ء تک رہی ۔ اس ملازمت کے آغاز میں یا اس سے کچھ پہلے جب کہ وہ تحصیل اسکول ، مہونہ (ضلع لکھنؤ) کے صدر مدرس تھے ، انہوں نے چند درسی رسالے لکھنے کا ڈول ڈالا ۔ ایسے ہی درسی رسالوں میں ایک رسالہ 'مجموعۂ سخن' تھا ۔ جو دو حصوں میں شائع ہوا تھا ۔ اس کا حصۂ اوّل کم از کم چالیس سال تک درسی نصاب کے طور پر رائج رہا ۔ میرے کتب خانے میں مجموعۂ سخن حصہ اوّل کے کئی ایڈیشن ہیں جن میں قدیم ترین مئی ۱۸۹۴ء کا ہے جو اکیسواں[۱] ایڈیشن ہے اور آخری ایڈیشن ۱۹۱۷ء کا ہے ۔ یہ اکیسواں[۲] ایڈیشن (مطبوعہ نولکشور ۔ لکھنؤ مئی ۱۸۹۴ء) کسی فقیر محمد کی ملک رہ چکا ہے جو "فوراس روڈ میونسپل اردو اسکول بمبئی" کا طالب علم تھا ۔ یہ مجموعہ

"مشتمل بر شعرائے متقدمین و سخنورانِ متاخرین مع اصولِ شعر و تذکرہ شعرا حسب ایمائے جناب کالن اے او برونگ صاحب بہادر ایم . اے ۔ ڈائرکٹر سابق سررشتۂ تعلیم اودھ ، پنڈت شیونرائن صاحب ڈپٹی انسپکٹر مدارس ضلع لکھنؤ و مولوی محمد حکیم الدین صاحب ہیڈ ماسٹر چوک

اسکول لکھنؤ و منشی غلام حسنین صاحب قدرؔ مرحوم ہیڈ ماسٹر مدرسہ
ہونہ ضلع لکھنؤ و پروفیسر فارسی کیننگ کالج نے بکمال تحقیق و تفتیش
اساتذۂ اردو ساکن لکھنؤ و دہلی کے کلامِ فصاحت فرجام سے تالیف
کیا اور صاحب محتشم الیہ کی سفارش سے کلکتہ یونیورسٹی کے سینٹ
نے اردو انٹرنس کورس میں داخل کیا واسطے منفعتِ عام طلبۂ مدارس
سرکاری کے باہتمام کارپردازان سررشتۂ تعلیم اودھ ...."

جیسا کہ اس اقتباس سے ظاہر ہے۔

ا۔ مجموعہ اکیس "شعرائے متقدمین و سخنورانِ متاخرین کے ۴۳ قطعوں اور نظموں پر مشتمل ہے۔ جن میں ایک قطعہ "عرضی بگزارشِ حالِ پُر ملال" اسد اللہ خاں غالبؔ کے کلام سے ہے۔

ب۔ اصولِ شعر کا بیان صرف اس حد تک محدود ہے کہ ہر قطعے یا نظم کا وزن اور ارکان بیان کر دیے گئے ہیں۔ غالبؔ کے قطعے کا وزن "اے شہنشاہِ آسمان اورنگ" کے لیے حاشیے میں درج ہے "بحرِ خفیف مجنون محذوف فاعلاتن مفاعلن فعلن (فاعلاتن مفاعلن فعلن یا فعلان کہنا چاہیے)۔

ج۔ منظوم کلام کے بعد رسالے میں مشکل الفاظ کی فرہنگ اور ان تمام شاعروں کا کچھ حال بھی دیا گیا ہے جن کا کلام درجِ رسالہ ہے اگرچہ اقتباس میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ رسالہ "بکمال تحقیق و تفتیش" تالیف ہوا ہے۔ مگر یہ بات تذکرۂ شعرا، خصوصاً غالبؔ کے تذکرے کے بارے میں نہیں کہی جا سکتی کیونکہ اس میں حسنین کی متعدد غلطیاں ہیں۔ اندازہ ہے کہ یہ تذکرہ غالبؔ کے انتقال کے آٹھ دس سال بعد ہی لکھا گیا ہے اور مولفوں میں غالبؔ کے ایک برگزیدہ شاگرد اور دوست قدرؔ بلگرامی بھی شامل ہیں مگر تعجب ہے کہ اس وقت تک غالبؔ کے حالاتِ زندگی (خصوصاً حسنین) کے بارے میں واقفیت بہت نامکمل تھی۔ رسالے میں غالبؔ کا سال ولادت ۱۷۹۵ء دیا ہے حالانکہ صحیح

۱۷۹۷ء (۲۷ دسمبر) ہے۔ وہ دلّی میں نہیں بلکہ آگرہ میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے چچا نصر اللہ بیگ خاں کی جاگیر یونہی ضبط نہیں ہوگئی تھی بلکہ ۱۸۰۶ء میں ان کے انتقال پر انگریزوں نے واپس لے لی تھی۔ غالب نہ ہی ۱۸۰۶ء کے فوراً بعد دلّی آکر آباد ہوئے تھے اور نہ انہوں نے گوشہ نشینی اختیار کی تھی۔ بلکہ انہوں نے ۱۸۱۲ء یا ۱۸۱۳ء میں دلّی میں مستقل سکونت اختیار کی تھی۔ اس سے چند سال پہلے سے ان کا دلّی آنا جانا تھا اور اسی دوران ۱۹ اگست ۱۸۱۰ء کو ان کی شادی بھی دلّی میں ہی ہوگئی تھی۔ گوشہ نشینی کا سوال ہی کہاں اٹھتا ہے۔ تاریخِ وفات کا تو کیا ہی کہنا۔ ذیقعدہ ۱۲۷۸ھ مطابق ۱۸۶۶ء یہ تو غالب کے انگریزی درباروں میں کرسی نشینی اور خلعت کے اعزاز کے دوبارہ اجراء کا زمانہ ہے۔ (۱۸۶۶ء سہو کتابت ہے ۱۸۶۲ء ہوگا) مگر تاریخِ وفات تو بہر حال ۲ ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ (۱۵ فروری ۱۸۶۹ء) ہی ہے[۱۲]

اگرچہ رسالہ مجموعۂ سخن بے حد مقبول ہوا، اور اس کا دوسرا حصّہ بھی منظرِ عام پر آگیا مگر پڑھنے والوں کے فہم سے بالاتر ثابت ہوا۔ چنانچہ جلد ہی اس کی شرح کی ضرورت پیش آئی وہ بھی بہت مقبول ہوئی اور چوتھی بار مطبع نولکشور لکھنؤ سے ۱۸۸۳ء میں چھپی۔ یہی ایڈیشن میرے پیشِ نظر ہے۔ نام "عطرِ مجموعہ" ہے اور یہ مجموعۂ سخن حصّہ اوّل کی شرح ہے۔ سرورق کی عبارت یہ ہے۔

عطرِ مجموعہ

حصّہ اوّل

تصنیفِ لطیف سخنورِ نامی گرامی واقف رموز و نکاتِ سخندانی سیّد غلام حسنین صاحب قدرؔ حسینی واسطی بلگرامی شاگردِ رشید مرزا غالب دہلوی مرحوم

شرح حصّہ اوّل مجموعۂ سخن

حسب الحکم جناب صاحب ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن ممالک مغربی و شمالی و اودھ واسطے تعلیم و تربیت طلبا مدارس صوبہ اودھ کے۔

چوتھی مرتبہ

مطبع نامی منشی نولکشور لکھنؤ میں چھپا ۱۸۸۳ء

کتاب ۳۰۰ سے زائد صفحات کو محیط ہے۔ پیش لفظ کی چند ضروری سطریں ملاحظہ کیجیے۔

رُباعی

کی تو نے رباعیِ عناصر پیدا
پھر مثنوی باطن و ظاہر پیدا
کر متن سے توسیعِ طبیعت یارب
کر شرح سے انشراحِ خاطر پیدا

بیشتر مجموعۂ سخن کے دو حصے ۔۔۔۔۔۔۔۔ قطعہ

دُرِ دُرجِ حکمت مہ برجِ رحمت
سحابِ فضیلت سمائے تبحّر
اگر نام نامی کوئی مجھ سے پوچھے
ہے کالن برونگ صاحب بہادر

۔۔۔۔ ڈایرکٹر اودھ ۔۔۔ کے حکم سے طبع ہوکر گردنِ مدارس میں حمائل اور اس میں سب طرح کے مضامین شامل ہوئے۔ لیکن اکثر کمندِ افہام اس کے خانۂ معانی کے لبِ بام تک نہ پہنچی اور پہلوانانِ ہفتخوانِ سخن نے اس بھاری پتھر کو چوم کر چھوڑ دیا۔ لہٰذا صاحب بہادر ۔۔۔۔ کے حکم کے موافق ۔۔۔۔۔۔ جناب پنڈت شیونراین ۔۔۔۔۔۔ ڈپوٹی انسپکٹر لکھنؤ ۔۔۔۔ کی شہ پاکر ہیچمدان ۔۔۔۔۔ سید غلام حسنین قدر نے حصہ اول کی شرح حاصل المتن لکھ کر پتھر کو موم ۔ موم کو پانی کیا اور اس رسالۂ مفیدِ عام کا نام عطرِ مجموعہ رکھ دیا ۔۔۔!

شرح، مجموعۂ سخن کے چھپے ہوئے نسخوں کے مطابق مرتب ہوئی ہے۔" جس مقام

سے متن کا صفحہ بدلا گیا ہے۔ وہاں شرح میں بھی لفظ صفحہ بہ صفحہ متن کے ہندسے پیشانی کا نشان کیا ہے۔ "پورے منظومات کی شرح کی گئی ہے اور حق یہ ہے کہ تشریح میں قدرتی" واقفِ رموز و نکات سخندانی" ہونے کا پورا پورا حق ادا کیا ہے۔ مجموعۂ سخن میں غالب کا جو قطعہ شامل ہے یہ وہی ہے جو بقول حالی مرزا نے بادشاہ کے حضور میں اس درخواست کے ساتھ گزرانا تھا کہ ان کی تنخواہ جو ششماہی گزرنے پر اکٹھی چھ مہینے کی ملا کرتی ہے وہ ماہ بماہ ملا کرے چنانچہ اس درخواست کے موافق تنخواہ ماہ بماہ ملنے لگی تھی۔ متداول دیوانِ غالب میں اس قطعے کا عنوان "گزارشِ مصنف بحضور شاہ" ہے اور مجموعۂ سخن میں "عرضی بگذارشِ حالِ پرملال"۔ قطعے کے کل شعر ۳۰ ہیں مگر مجموعۂ سخن میں ۲۵ شامل کیے گئے ہیں۔ یہ پانچ شعر چھوڑ دیے گئے ہیں۔

آج مجھ سا نہیں زمانے میں
شاعرِ نغز گوے خوش گفتار

❖

رزم کی داستان گر سنیے
ہے زباں میری تیغِ جوہر دار

❖

بزم کا التزام گر کیجے
ہے قلم میرا ابرِ گوہر بار

❖

ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد
قہر ہے گر کرو نہ مجھ کو پیار

❖

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا
آپ کا نوکر اور کھاؤں ادھار

وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ غالبؔ نے یہ قطعہ کب کہا تھا مگر وہ اپنے ایک خط مورخہ ۲۱ر جنوری ۱۸۵۱ء کو منشی نبی بخش حقیرؔ کو لکھتے ہیں (نادراتِ غالبؔ ص ۸)

"اب چھ مہینے پورے ہو چکے، جولائی سے دسمبر ۱۸۵۰ء تک، اب میں دیکھوں یہ ششماہی مجھے کب ملتا ہے۔ بعد اس کے ملنے کے اگر آئندہ ماہ بماہ کردیں گے تو میں لکھوں گا ورنہ اس خدمت کو میرا سلام ہے۔ ابھی بابر کا حال حضور میں بھی نہیں بھیجا۔ کل مسوّدہ تمام ہوا ہے۔ صاف ہو رہا ہے اب صاف کر کر دے دوں گا۔ اور ماہ بماہ کی استدعا کروں گا۔ چھ ماہی آخر ہونے کو تھی، اس واسطے متوجہ ہو کر میں نے اس کو تمام کیا۔"

ظاہر ہے کہ کچھ عرصے بعد، بابر کے حال کے ساتھ ہی مرزا نے یہ منظوم عرضداشت بھی بادشاہ کے حضور گزرانی ہو گی اور تنخواہ ماہ بماہ ملنے لگی ہو گی اور ۱۸۵۷ء کے ہنگامے تک یہی طریقہ رائج رہا ہو گا۔ اگرچہ جون ۱۸۶۰ء میں حکم ہو گیا تھا کہ پنشن سال میں دوبارہ ملا کرے گی۔ مگر یہ پنشن تھی تنخواہ نہ تھی۔ چنانچہ مرزا ۲۰ر جولائی ۱۸۶۰ء کو ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں۔
(غالب کے خطوط۔ حصہ اوّل۔ ص ۳۲۳)

"آخر جون میں پنجاب سے حکم آگیا کہ پنشن دارانِ قدیم ماہ بماہ نہ پائیں۔ سال میں دوبار بطریق ششماہیہ فصل بہ فصل پایا کریں ناچار ساہوکار سے سود کاٹ کر روپیہ لیا گیا تا رام پور کی آمد میں مل کر صرف ہو۔ یہ سود چھ مہینے تک اسی طرح کٹوا دینا پڑے گا۔ ایک رقم معقول گھاٹے میں جائے گی۔"

پھر اسی ۱۸۵۱ء والی منظوم عرضی سے دو شعر اس خط میں چسپاں کرتے ہیں۔

"رسم ہے مُردے کی چھ ماہی ایک	خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو کہ ہوں بقیدِ حیات	اور چھ ماہی ہو سال میں دوبار

اب عطرِ مجموعہ سے غالب کے قطعے کے ۲۵ اشعار کی شرح پیش کی جاتی ہے .

۱۔ اے شہنشاہِ آسماں اورنگ
اے جہاں دارِ آفتاب آثار

شہنشاہ، وہ بادشاہ کئی شاہ جس کے مطیع ہوں ۔ اورنگ بفتح اوّل، تخت سلطنت آسماں اورنگ، اسمِ صفت مرکب یعنی جیسا آسمان ہے ایسا تخت رکھنے والا، جہاندار اسم فاعل سماعی، جہان کا رکھوالا ۔ آفتاب، سورج ۔ آثار، قدموں کے نشان ، آفتابِ آثار صفت مشبہہ یعنی سورج کے مثل روشن نشانہائے قدم رکھنے والا ۔ شہنشاہ موصوف آسمان اورنگ اس کی صفت ہے، اے حرف ندا ۔ موصوف مل کر منادی ہوا ۔ ندا منادی مِل کر فاعل ۔ سُن فعل امر حاضر مقدر ۔ فعل امر ساتھ فاعل اور حرف ندا کے مل کر جملہ انشائیہ ہوا ۔ مصرع دوم کی ترکیب بھی ایسی ہے ۔ مطلب ۔ اے بادشاہ تیرا تخت آسمان کے مثل ہے اور جس طرح آفتاب آسمان پر ہے اسی طرح تیرے قدم مبارک تخت پر ہیں تو میری وہ بات سُن لے جو آئندہ بیان ہے ۔ یہاں سریرِ سلطنت کو آسمان سے اور آثارِ قدم کو آفتاب سے تشبیہ ہے ۔

۲۔ تھا میں اک بے نوائے گوشہ نشیں
تھا میں اک دردمندِ سینہ فگار

بینوا، مرد بے سامان اور درویش خاموش گوشہ نشین، خلوت میں بیٹھنے والا، مرادی معنی جس کو کوئی نہ جانتے ۔ دردمند صاحب درد فگار زخم وزخمی سینہ فگار، اسم صفت مرکب جس کا سینہ زخمی ہو مرادی معنی نہایت دردمند ۔ مطلب ۔ میں ایک بینوا تھا مگر کیسا بینوا جسے کوئی نہ پوچھے اور میں ایک دردمند تھا مگر کیسا دردمند جو قریب بمرگ ہو ۔

۳۔ تم نے مجھ کو جو آبرو بخشی
ہوئی میری وہ گرمیِ بازار

آبرو، عزت - گرمیِ بازار، شہرت - مطلب اے بادشاہ تمہارے عزت دینے سے میری وہ توقیر اور شہرت ہوئی جیسا آئندہ مذکور ہے -

۴- کہ ہوا مجھ سا ذرۂ ناچیز
روشناسِ ثوابت و سیّار

ذرہ، پتھر کا ریزہ جو آفتاب سے خاک میں چمکتا ہے - ذرۂ ناچیز، نہایت کم حقیقت شے - روشنا، روشن کرنے والا یہ لفظ روشنان کا مخفف ہے اور اس میں الف و نون فاعلی ہے - کذا فی الغیاث - مگر راقم کے نزدیک خود لفظ روشن میں صرف الف فاعلی مل کر روشنا ہوا جیسے ہراس سے ہراسا و گوار سے گوارا ثوابت ثابت کی جمع ہے وہ تارے جو گردش نہ کریں - جیسے کل تارے جو دکھائی دیتے ہیں - سبع سیارہ چھوڑ کر - سیار سیر کرنے والا اور وہ تارا جو گردش کرے جیسے مریخ و زحل وغیرہ بہ تحقیق بطلیموس سات ہیں اور بموجب نظام فیثاغورس ان کی تعداد گیارہ ہے - مطلب - اے شہنشاہ تمہاری توجہ سے مجھ سا ایک ذرۂ حقیر بھی ستاروں کو رونق دینے لگا یعنی ستاروں سے بھی بلند اور رونق دار ہوگیا ایسے طالع جاگے -

۵- گرچہ از روئے ننگِ بے ہنری
ہوں میں اپنی نظر میں اتنا خوار

از روئے بمعنی بسبب، ننگ، شرم و غیرت بے ہنری کوڑ مغزی - خوار ذلیل - مطلب اگرچہ میرا یہ حال ہے کہ مجھ میں کوئی ہنر نہیں اور اس کوڑ مغزی کے سبب سے مجھے اس قدر ننگ و غیرت ہے کہ میں اپنے دل میں خود اپنے کو اتنا ذلیل و خوار سمجھتا ہوں جیسا آئندہ بیان ہے - یہ شعر اپنے مابعد سے قطعہ بند ہے -

۶- کہ گر اپنے کو میں کہوں خاکی
جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار

اپنے کو - دہلی والے بجائے ذات خود استعمال کرتے ہیں اور اہل لکھنؤ اس مقام پر

(آپ کو) بولتے ہیں اور قدما اس محل پر (اپنے تئیں) کہتے ہیں۔ مولف نثر میں یہاں اہل دہلی کا اور نظم میں لکھنویوں کا مقلد ہے۔ خاکی، خاک کا بنا ہوا شخص۔ عار، ننگ و شرم۔ مطلب۔ اگر اپنے کو میں یہ کہوں کہ خاکی جسم رکھتا ہوں اور خاک یہ بات سن لے تو خاک کو بھی غیرت آئے کہ ناحق مجھ سے ایسا بشر پیدا ہوا جو اتنا بے ہنر نکلا۔

۷۔ شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ ہوں

بادشہ کا غلام کار گزار

پہلے مصرعے کا (ہوں) دوسرے مصرعہ میں لگا کر پڑھو تو معنی شعر آئینہ ہیں۔ کار گزار قابل و لائق۔ مطلب۔ باوجود اس قدر ذلت کے میں اپنے دل میں اس بات پر خوش ہوں کہ تم مجھے اپنا غلام سمجھتے ہو اور میں کیسا غلام کہ لائق۔

۸۔ خانہ زاد اور مرید اور مداح

تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار

خانہ زاد۔ اصطلاحاً بمعنی غلام زادہ و استعمالاً بجاے کمترین۔ مرید، چیلا۔ مداح، تعریف کرنے والا، مراد شاعر سے بھی لیتے ہیں۔ عریضہ نگار، خط لکھنے والا یہاں مراد اس قطعہ گو سے ہے۔ مطلب۔ میرے واسطے تین خدمتیں مقرر تھیں ایک تو آپ کا میں خانہ زاد تھا، یعنی میرے باپ دادا اسی خاندان کے پرورش یافتہ تھے۔ دوسرے میں آپ کا مرید تھا تیسرے میں آپ کا مداح تھا۔ واضح ہو کہ بہادر شاہ بادشاہ اخیر دہلی کو مذہب صوفیہ کی طرف نہایت توجہ تھی۔ خود بدولت پیر بنے تھے اور چند عمائد کو اپنا مرید بنایا تھا ان لوگوں نے بھی از روے تصنع مریدی اختیار کر لی تھی چنانچہ حضرت استاد نا مرحوم نور اللہ مرقدہ نے بھی از روے تقیہ یہ امر گوارا کر لیا تھا۔ غلام کار گزار اور عریضہ نگار سے مراد یہاں خود حضرت غالب ہے۔

۹۔ بارے نوکر بھی آگیا صد شکر

نسبتیں ہو گئیں مشخص چار

بارے، دفعتہ و اتفاقیہ نسبت، آپس کا لگاؤ۔ مشخص، تجویز۔ مطلب۔ تین باتوں میں

بندہ آپ سے منسوب تھا جیسے اوپر خبر دی اب میرے نوکر ہونے سے مجھ میں اور آپ میں گویا چار نسبتیں تجویز و مقرر ہو گئیں ۔

۱۰ ۔ نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں
مدّعائے ضروری الاظہار

ضروری الاظہار مدّعا ، وہ مقصد جس کا بیان کرنا ضرور اور واجب ہو ۔ تم سے نہ کہوں تو کس سے کہوں یہ اصطلاح اپنے مطلب کو بہ خوشامد بیان کرنے کی حالت میں لاتے ہیں اور اس سے عرضِ حال اور سماعتِ مطالب میں تاکید ہو جاتی ہے ۔ مطلب ۔ یہ ضروری مدّعا اگر آپ سے نہ کہوں تو کون سننے والا ہے ذرا مجھ پر توجہ فرمایئے کہ میرا مقصد آگے بیان ہے ۔

۱۱ ۔ پیر و مرشد اگرچہ مجھ کو نہیں
ذوقِ آرائشِ سر و دستار

پیر و مرشد منادی بجائے خداوندِ نعمت آتا ہے ، اس کے ساتھ حرف ندا مقدر لاتے ہیں ۔ ذوق ، ذائقہ و شوق ۔ آرائش ، درستی اور بناؤ ۔ دستار ، پگڑی ۔ مطلب ۔ اے پیر و مرشد اگرچہ مجھ کو اپنے سر کی آرائش کا شوق نہیں کہ پگڑی سے اسے آراستہ رکھا کروں اور پگڑی کی آراستگی کا بھی ذوق نہیں کہ ہمیشہ عمدہ ہی پگڑی باندھا کروں ، ننگے سر ہوں تو واہ واہ اور میلی کچیلی موٹی مہین جیسی پگڑی ملے اس پر راضی ، مگر کچھ تو مجھے ضرور چاہیئے جیسا آگے مذکور ہے ۔

۱۲ ۔ کچھ تو جاڑے میں چاہیئے آخر
تا نہ دے بادِ زمہریر آزار

آخر ، اصطلاح میں ضرور کے محل پر آتا ہے ۔ باد ، ہوا ۔ بادِ زمہریر ، سرد ہوا ۔ آزار ، تکلیف و بیماری ۔ مطلب ۔ چاہے سر برہنہ رہوں چاہے موٹی جھوٹی پگڑی ہو یہ باتیں گوارا ہو سکتی ہیں مگر جاڑوں میں ننگے بدن تو نہیں رہا جاتا رضائی و گلا وغیرہ کچھ تو ضرور نصیب ہونا چاہیئے تاکہ جاڑا نہ کھاؤں ۔

۱۳ ۔ کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش
جسم رکھتا ہوں ، ہے اگرچہ نزار

درکار، ضروری ۔ پوشش، پہننے کے کپڑے، یہاں جڑاول سے مراد ہے ۔ جسم، بدن ۔ نزار، دُبلا ۔ مطلب ۔ اگرچہ میرا بدن دبلا ہے، کچھ لکڑی پتھر نہیں بلکہ ضعیف اور لاغر کو سردی زیادہ اور جلد اثر کرتی ہے، پھر مجھے کپڑوں کی ضرورت اور جڑاول کی حاجت کیونکر نہ ہو، آپ ہی داد دیجئے اور رحم کیجیے ۔

۱۴ ۔ کچھ خریدا نہیں ہے اب کے سال
کچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار

خریدا، مصدر خریدنا کا ماضی مطلق، مستحسن الترک ۔ یعنی خرید کیا بنانا محاورہ ہے لفظ (کپڑے) بھی کپڑے بنانے کے محل پر آتا ہے اور عوام ہنود اس لفظ کو کھانا پکانے کے مقام پر استعمال کرتے ہیں اور گستا نگر دیہاتی شعر کہنے کی جگہ پر بولتے ہیں اور اصطلاحاً کسی کو بیوقوف بنانا یہاں بمعنی اول ہے ۔ مطلب ۔ میں نے اب کے جاڑوں میں کچھ کپڑا مول نہیں لیا کہ دام ہی گرہ میں نہ تھے اور کچھ جڑاول نہیں بنائی کہ کپڑا ہی نہ تھا ۔ جامہ ندارم دامن از کجا آرم ۔ غرض جاڑا کھا رہا ہوں ۔

۱۵ ۔ رات کو آگ اور دن کو دھوپ
بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار

بھاڑ میں جانا ایک محاورہ، محل خفگی کے وقت دور ہونے کے محل پر بولتے ہیں ۔ لیل، شب ۔ نہار، روز ۔ لیل و نہار، ایام زندگی ۔ مطلب ۔ رات بھر آگ اور دن بھر دھوپ کے سہارے زندگی بسر کرتا ہوں ایسے زندگی کے دن خدا دور کرے تو بہتر یعنی اس تکلیف سے مرنا اولیٰ ہے ۔

۱۶ ۔ آگ تاپے کہاں تلک انسان
دھوپ کھائے کہاں تلک جاندار

مطلب، آدمی سے نہ عمر بھر آگ تاپ کر زندگی بسر کی جاتی ہے اور نہ ہمیشہ دھوپ کھا کر دن کاٹے جاتے ہیں پھر مجھ سے کیوں کر ہو سکے ۔

۱۷ - دھوپ کی تابش آگ کی گرمی
وَقِنَا رَبَّنَا عَذَابَ النَّارِ

تابش : تافتن کا حال مصدر، یہاں دھوپ کی تیزی سے مراد ہے۔ مطلب، یہ دھوپ کی تیزی اور یہ آگ کی گرمی ہم پر پڑتی ہے گویا ہم جہنم میں دن رات جل رہے ہیں، پس اے ہمارے پروردگار اس دوزخ کے عذاب سے ہم کو بچا لے وَقِنَا رَبَّنَا عَذَابَ النَّارِ یہ ایک دعا کا جملہ ہے شاعر نے بطریقِ تضمین اپنی نظم میں ملا لیا (تضمین) غیر کا کلام اپنے کلام میں ملا لینا مگر اس خوبصورتی سے کہ دونوں مل کر معنی میں ایک ڈال ہوجائیں اور یہ امر داخل صنعت ہے اگر اس کلام کو لوگوں نے اس کے مصنّف کے نام سے کم سُنا ہو تو قائل کا نام بھی بیان کرنا ضرور ہے جیسے ناسخ کا مصرع حضرتِ غالب نے لے کر ان کا نام کہہ دیا ہے

غالب اپنا بھی عقیدہ ہے بقولِ ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

تضمین ایک عیب کا بھی نام ہے۔

۱۸ - میری تنخواہ جو مقرر ہے
اس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار

ہنجار، طریقہ و قاعدہ و رسم و راہ۔ مطلب۔ میرا مہینہ جو آپ نے مقرر کیا ہے۔ عجب طرح سے ملا کرتا ہے جیسا آئندہ مذکور ہے۔

۱۹ - رسم ہے مردے کی چھ ماہی ایک
خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار

رسم، قاعدہ و قانونِ قومی، چھ ماہی وہ فاتحہ جو مرنے کے چھ مہینے کے بعد ہوا اور وہ ایک ہی بار ہوتا ہے پھر جو اس سے چھ مہینے کے بعد فاتحہ کرتے ہیں اُسے برسی کہتے ہیں۔ مدار جائے دور یہاں بمعنی عمل ہے۔ مطلب۔ مردے کی چھ ماہی کا ایک ہی بار دستور ہے اور خلق اللہ کا اسی قاعدے پر عمل چلا آتا ہے۔

۲۰ ۔ مجھ کو دیکھو تو ہوں بقیدِ حیات
اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار

مجھ کو دیکھو یعنی میرے پر خیال کرو، یہ محاورہ مخاطب کو متوجہ کرنے کے واسطے لاتے ہیں ۔ بقیدِ حیات ہونا، بطریق استعارہ بمعنی زندہ رہنا۔ مطلب ۔ میرے حال پر ذرا خیال کیجیے کہ باوجودے کہ زندہ ہوں مگر ایک ایک سال میں دو دو بار چھ ماہی ہوتی ہے جو بات مردے کے واسطے نہیں ہوتی وہ میرے واسطے ہوتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یعنی چھ مہینے چڑھ کر حضور کی سرکار سے تنخواہ ملا کرتی ہے ۔ واضح ہو کہ بہادر شاہ کی سرکار میں ششماہہ تقسیم ہوتا تھا ۔

۲۱ ۔ بسکہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض
اور رہتی ہے سود کی تکرار

بسکہ، نہایت ۔ مطلب ۔ میرے ہر مہینے میں قرض لینے اور سود بڑھنے کے سبب وہ ہوتا ہے جو شعر آئندہ میں ہے ۔

۲۲ ۔ میری تنخواہ میں تہائی کا
ہو گیا ہے شریک ساہوکار

ایک چیز کے تین برابر حصے کر کے ایک حصے کا نام تہائی ہے، شریک، ساجھی — ساہوکار، مہاجن ۔ مطلب تہائی تنخواہ میری سود ہی میں بھگت جاتی ہے ، ساہوکار کیا ہے گویا میری تنخواہ کا شریک پیدا ہوا ہے یعنی اس ایک تنخواہ پر میں اور ساہوکار دونوں پکے نوکر ہیں ۔

۲۳ ۔ میری تنخواہ کیجیے ماہ بماہ
تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار

ماہ بماہ، مہینے مہینے برابر وصول ہونے والی تنخواہ ۔ دشوار، سخت ناگوار و مشکل مطلب، ماہ بماہ میری تنخواہ ادا کر دیا کیجیے ۔ تاکہ میں بے قرض و دام بخوبی زندگی گزار سکوں ۔

۲۴۔ ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام

شاعری سے مجھے نہیں سروکار

ختم، تمام شاعری سے غرض، یہاں بے اندازہ مدح ۔ سروکار، غرض و مطلب ۔

مطلب ، اب میں یہ قطعہ دعا پہ ختم کرتا ہوں یعنی اس عرضی کے آخر میں ایک دعائیہ شعر لکھ کر عرضی بند کرنے کا ارادہ ہے زیادہ شاعری یہاں مجھے خرچ کرنی نہیں منظور، طول دینے سے کیا مطلب فقط دعا کافی ہے ۔

۲۵۔ تم سلامت رہو ہزار برس

ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

سلامت، پور ارہنا، مراد یعنی زندہ رہنا ۔ یہی دعائیہ شعر ہے جس کا ذکر شعر ماقبل میں آچکا ہے ۔ مطلب دنیا میں ہر ایک سال تین سو پینسٹھ دن کا ہوتا ہے مگر یہاں شاعر کی مراد یہ ہے کہ خداوند قدیر ایک ایک سال پچاس پچاس ہزار دن کا بنا دے اور پھر بادشاہ کی عمر انہیں دنوں کے حساب سے ہزار برس کی ہو ۔ اس حساب سے بادشاہ کی عمر بقیہ ایک لاکھ چھتیس ہزار نو سو چھیاسی سال سے کچھ زیادہ ہوگی ۔ ایسی زیادہ گوئی کو فن شعر میں اغراق کہتے ہیں ۔

حواشی

لہ اصل میں قدر نے چار استادوں سے اصلاح لی تھی ۔ ان کے نام یہ ہیں، شیخ امام علی سحر، فتح الدولہ مرزا محمد رضا برق، امداد علی بحر، مرزا غالب چنانچہ ایک رباعی میں ان چاروں کا ذکر کیا ہے ؎

سیکھے سحر و برق سے بندش کے بند ۔ پھر غالب و بحر نے بتائے پیوند

مجھ سا بھی زمانے میں نہ ہوگا اے قدر ۔ بدنام کنندۂ نکو نامے چند

۲۔ تذکرے میں لکھا ہے کہ غالبؔ "فارسی میں ایک آتش پرست کے شاگرد تھے ۔۔۔"
ظاہر ہے کہ یہ اشارہ مُلا عبدالصمد کی طرف ہے اور یہ بیان غالبؔ کے شاگرد قدرؔ بلگرامی کے ایماء سے شامل کیا گیا ہے گویا حالیؔ کے تائیدی بیان اور حکیم غلام رضا خان کے تردیدی بیان کے بعد قدرؔ کا یہ بیان غالبؔ کے تیسرے عزیز کا بیان ہے جو اتفاق سے مُلا عبدالصمد اور غالبؔ کے تعلق کی تائید کرتا ہے ۔

۳۔ غالبؔ کے متداول دیوان کے قلمی نسخوں اور حیاتی ایڈیشنوں میں "روشناس" درج ہے یعنی ثوابت و سیارے مجھے پہچاننے لگے ۔ "روشنائے" صرف قدرؔ نے لکھا ہے ۔ نہ جانے کہاں سے لیا ہے ۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ قدرؔ نے روشنائے ثوابت و سیارہ کہہ کر شعر کو جو معنی پہنائے ہیں وہ قابلِ غور ہیں ۔

۴۔ 'میں' کی جگہ 'خود' ہونا چاہیئے ۔

۵۔ صحیح 'لیکن' ۔

۶۔ نظمؔ طباطبائی لکھتے ہیں کہ "لفظ عریضہ مولدین کی گڑھت ہے ۔ عربی صحیح میں ان معنی پر نہیں آیا" نہ آیا ہوگا مگر اردو میں غالبؔ کے عہد تک زبانوں پر درخواست کے معنوں میں رائج ہو چکا تھا ۔ جیسے منیرؔ ــــ

نوشتہ ہے منیرِ بے نوا کا ⁂ شہنشہ کو عریضہ ہے گدا کا

۷۔ نظمؔ طباطبائی فرماتے ہیں "۔۔۔ انسان کے لباس کو پوشش اردو کے محاورے میں نہیں کہتے فارسی میں درست ہو ۔۔۔" لیکن غالبؔ کے عہد تک پوشش انسان کے لباس کے معنی میں رائج ہو چکا تھا جیسے ظفرؔ ــــ

ہم وہ بے برگ و نوا ہیں وقت مستی ساقیا
پوشش اپنی برگ ہائے تاک سے پیدا ہوئی

۸۔ متداول دیوان میں "کہ" اور یہی صحیح ہے ۔

۹۔ بعض نسخوں میں 'چہارم' ہے ۔ سود کے لحاظ سے 'تہائی' میں زیادہ مبالغہ ہے ۔

کنز المطالب شرحِ دیوانِ غالبؔ

میں

شارح کے کچھ ذاتی مشاہدے

اِس شرح کے "حرفِ آغاز" میں، خیرؔ بہوروی مرحوم لکھتے ہیں

۱۔ "پیشِ نظر شرح "کنز المطالب شرحِ دیوانِ غالبؔ" مولانا ابوالحسن ناطقؔ گلاؤٹھوی کی تصنیف ہے۔ مولانا ناطقؔ، مرزا داغؔ دہلوی کے ارشد تلامذہ میں بڑے صاحبِ فن استاد مانے جاتے ہیں ...."

پھر لکھتے ہیں

۲۔ "امید ہے یہ مفید شرح جو غالبیات میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے، دیوانِ غالبؔ ہی کی طرح مقبول ہوگی........"

خیرؔ مرحوم مندرجہ بالا اقتباسات سے چند سطریں پہلے یہ لکھ چکے تھے

۳۔ "........ بیڈھبؔ بنارسی کی شرح ...... تخلّص کی مناسبت سے 'بیڈھب' بھی ہے اور 'کڈھب' بھی۔ اسی طرح کی مہمل اور گمراہ کن شرحیں اور بھی چھپی ہیں ——— آپ جانیں..............................

جوشؔ ملسیانی کی شرح کے لیے غالبؔ کے اس شعر کو
عنوان بنا سکتے ہیں ؎

خامہ انگشت بہ دنداں کہ اسے کیا لکھیے
ناطقہ سر بگریباں کہ اِسے کیا کہیے "

معلوم نہیں، خیرؔ صاحب نے جناب جوشؔ ملسیانی اور ان کی شرح غالبؔ پر نزلہ کیوں اتارا۔ حالانکہ جو کچھ (۱) اور (۲) کے تحت جنابِ ناطقؔ مرحوم اور ان کی شرحِ دیوانِ غالبؔ کے لیے خیرؔ صاحب نے کہا ہے۔ اگر اُس سے زیادہ نہیں تو کم از کم اتنا تو جنابِ جوشؔ اور اُن کی شرحِ دیوانِ غالبؔ کے لیے بھی کہا ہی جا سکتا ہے اور یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ جہاں 'کنز المطالب' صرف ایک ہی بار چھپی، جناب جوشؔ ملسیانی کی شرحِ دیوانِ غالبؔ کے ۱۹۵۸ء تک پانچ ایڈیشن نکل چکے تھے۔ جوشؔ صاحب اور ناطقؔ صاحب کے مابین خط و کتابت[۲] سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر دو شاگردانِ داغؔ میں علمی، ادبی اور فنی سطح پر بے حد یگانگت تھی۔ قبلہ جوشؔ ملسیانی میرے استاد تھے تاہم میری نظر میں یہ دونوں بزرگ یکساں طور پر اعلیٰ مقام پر فائز ہیں۔

جنابِ ناطقؔ مرحوم نے 'کنز المطالب' بڑی دقتِ نظری سے تصنیف کی ہے اس میں زبان و بیان کے بھی بہت سے نکتے زیرِ بحث لائے گئے ہیں اور ناطقؔ صاحب نے تقریباً ہر باب پر ضمنی فیصلہ بھی صادر فرمایا ہے۔ ان میں کے بعض مشاہدات ایسے ہیں جو ذاتی ہیں اور جناب ناطقؔ ہی سے مخصوص ہیں۔ ذیل میں انہیں کو نمایاں کیا گیا ہے۔

---

[۱] فروری ۱۹۶۸ء میں۔

[۲] اس خط و کتابت (کل خط ۱۲) کی نقل جناب محمد عبد الحلیم ناگپوری صاحب نے مجھے فراہم کی تھی۔

بعض مقامات پر میں نے حواشی کا اضافہ کر دیا ہے۔ جس کا مقصد جناب ناطق مرحوم کی خامیاں نکالنا نہیں بلکہ حقائق کو صحیح تر شکل میں پیش کرنا ہے۔

۱۔ نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

نقشِ ہستی اپنے مصوّر یعنی صانع کی اس شوخ نگاری کا شاکی ہے کہ اس نے میری ہر تصویر کو کاغذی پیراہن پہنایا یعنی بے حقیقت بنایا اس میں جو بیانِ استفسار ہے اُسے طنزیہ لیا جائے اور صانع قدرت مخاطب مانا جائے تو حسن بیاں پیدا ہوتا ہے ؎

گیا حسن خوبانِ دلخواہ کا ہمیشہ رہے نام اللہ کا

(ناطق) ثباتِ نقشِ ہستی دیکھکر تحریر ہنستی ہے طرب آمادۂ تمثال پر تصویر ہنستی ہے

خود مصنّف نے اس شعر کی یوں تشریح کی ہے کہ تصویر چونکہ کاغذ پر ہوتی ہے اس لیے اسے فریادی کہا کیونکہ ولایت ایران میں فریادی کاغذی پیراہن پہن کر عدالت میں جاتے تھے۔ مطلب یہ کہ چونکہ ہستی موجب ملال و آزار ہے اس لیے تصویر بھی اپنے صانع کی بہ زبانِ حال شکایت کرتی ہے کہ مجھے بنا کر کیوں مبتلائے رنج ہستی کیا۔ مرزا کے بیان کردہ مطلب پر لوگوں کا یہ اعتراض کہ ایران میں ایسا رواج ہونے کا ثبوت نہیں ملتا اس لیے اسے مہمل ٹھہراتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسا ثبوت اگر نہ بھی ہو تو شعر کو مہمل نہیں کہا جا سکتا کیونکہ کاغذی پیراہن کی اصطلاح کا وجود بمعنی فریادی ایران کی شاعری میں موجود ہے مثلاً ؎

(کلیم کاشانی) کاغذی جامہ بپوشید و بدرگاہ آمد زادۂ خاطرِ من تا بدہی دادِ مرا[1]

خود مصنّف نے بھی ایک اور شعر اسی اصطلاح کا لکھا ہے جو اگرچہ اس دیوان میں نہیں آیا مگر نسخۂ حمیدیہ اور مولانا آسی کے غیر مروجہ دیوانِ غالب میں موجود ہے ؎

---

[1] فرہنگ آنندراج (بحوالہ بہارِ عجم) میں اس شعر کو کمال اسمٰعیل کی تصنیف کہا گیا ہے۔

(غالبؔ) تیرے بیمار پہ ہیں فریادی وہ جو کاغذ میں دوا باندھتے ہیں[1]

مومن خاں کے دیوان میں بھی یہ شعر موجود ہے ؎

(مومنؔ) تظلم فرقِ معنی کے سبب تھا لباسِ کاغذی بے وجہ کب تھا

اس سے معلوم ہوگیا کہ اگر یہ امر واقعہ بھی نہیں تو تخئیلِ شعر میں ضرور داخل ہے ایسی حالت میں اگر کوئی خیال غلط واقعہ سے بھی متعلق ہو تو شاعر پر اس کی ذمہ داری نہیں آتی مثلاً اگر آج محملِ لیلیٰ اور ملاقاتِ مجنوں کے واقعہ کو غلط ثابت کر دیا جائے تو معترضینِ غالبؔ خود بھی اس پر آمادہ نہ ہوں گے کہ اِس مضمون کے تمام اشعار کو جو اب تک لکھے گئے ہیں مہمل قرار دے دیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فنِ سخن میں بنیادِ تخئیل ہمیشہ واقعاتِ مشہورہ پر ہوتی ہے چاہے وہ غلط ہی کیوں نہ ہوں[2]۔

---

[1] ؎ نقش فریادی ہے کس کی ... الخ یہ شعر غالبؔ نے ۱۸۱۶ء یا اس سے پہلے فکر کیا تھا۔ غالبؔ نے یہ تلمیح دوسرے اردو اشعار میں بھی استعمال کی ہے ایک تو اسی شعر میں جو ناطق مرحوم نے درج کیا ہے (نگر کردہ ۱۸۲۱ء) دوسرے دو شعر یہ ہیں ؎

پہنے ہے پیرہنِ کاغذِ ابری، نیساں یہ تنک مایہ ہے فریادیِ جوشِ ایثار (۱۸۲۱ء)

دادخواہِ تپش و مہرِ خموشی بر لب کاغذِ سرمہ ہے جامہ ترے بیماروں کا (۱۸۱۶ء)

[2] جناب ناطق مرحوم کی دی ہوئی فارسی شعر کی سند کے علاوہ اہلِ ایران کے کلام میں اس رسم کی تلمیح کئی اشعار میں استعمال کی گئی ہے۔ بہارِ عجم اور فرہنگِ آنند راج میں یہ اشعار درج ہیں ؎

زخوباں دادمی خواہم فغانی! مہربانے کو کہ سازد کاغذیں پیراہن از طومارِ افسونہم (باباؔ فغانی)

تا کہ دستِ قدر از دستِ تو بر بود قلم کاغذیں پیرہن از دستِ قدر باد بلار (خاقانیؔ)

کاغذیں جامہ چو صبح آیی برآرم ہر شبی تا کجا خواہد رسیدن زیں تظلم کارِ من (سیف الدین اسفرنگیؔ)

(٢) میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا[1]
میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

...... لفظ "پرے" متقدمین نے کثرت سے نظم کیا ہے اور اب تک دہلی اور اس کی نواح میں زبان زد عام ہے اضلاع میرٹھ، بلند شہر اور علی گڑھ کے اہلِ علم اور شرفاء اسے بکثرت بولتے ہیں اور یہ اضلاع قصبہ سردھنا سے لے کر شہر علی گڑھ تک آج بھی دہلی کی قدیم اردو کے مرکز ہیں، یہاں کے قصبات میں ان اثرات نے دخل نہیں کیا جو بعد میں دہلی پر چھا گئے اس لیے آپ کو یہ سُن کر تعجب نہ ہونا چاہیے کہ آج تک اس نواح کے لوگ میر و سودا کی زبان کے بہت سے الفاظ اور محاورے بلا ردّ و بدل استعمال کرتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ قصبات دہلی سے زیادہ فصیح سمجھے جانے کے مستحق ہیں کیونکہ اگر آج دہلی اور لکھنؤ کے پاس شعراءِ حال کی سند ہے تو اس علاقے کے پاس جو نواحِ دہلی کہلاتا ہے میر، سودا، درد، غالب، مومن اور ذوق کے الفاظ کی سند موجود ہے اس لیے جن لوگوں نے اپنی زبان بدل ڈالی انہیں یہ حق نہیں کہ ان لوگوں پر اعتراض کریں، جو اپنی آبائی زبان کو ہنوز قائم رکھے ہوئے ہیں اور وہی بولتے ہیں۔ آخر عرب میں بھی تو یہی ہوا تھا کہ جب شہروں کی زبان میں عجمی الفاظ نے آکر دخل کر لیا تو پھر شہروں کی سند نہیں رہی اور قصبات و دیہات کی زبان مستند ہو گئی مگر ان قصبات ہی سے بحث نہیں لفظ "پرے" تو اب تک دہلی اور اکبر آباد

---

[1] اس شعر کی تشریح کرتے ہوئے جناب ناطق نے لفظ "پرے" کے استعمال پر دلچسپ بحث کی ہے۔ یہاں صرف اسی سے متعلق مواد درج کیا جا رہا ہے۔

میں بھی بے تکلف بولا جاتا ہے مرزا داغ نے دہلوی ہوتے ہوئے۔ جو
اب سے پچاس برس پہلے اسے ترک کر دیا تو اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی
ہے کہ آپ قیامِ رامپور کے زمانہ میں اہلِ لکھنؤ سے گھرے ہوئے تھے۔
اس لیے لکھنؤ والوں میں رہ کر ان کے متروکات کو خود تنہا استعمال کرتا
پہلے تو نامناسب سمجھا اور بالآخر یہ لفظ ان کی زبان سے اڑ گیا اس طرح
داغ مرحوم نے اسے متروکات میں شامل کر کے دہلی کی زبان کے ساتھ
بے انصافی کی مگر مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ حضرت داغ اس لفظ کو اخیر
تک نہایت فصیح سمجھتے تھے چنانچہ سُنا ہے کہ اس لفظ سے بحث کرتے
ہوئے آپ نے حیدرآباد میں ایک لکھنوی اہلِ ادب کو یہ شعر سُنایا ؎

(مومن) چل پرے ہٹ مجھے نہ دکھلا منہ
اے شبِ ہجر تیرا کالا منہ

اور فرمایا کہ اگر یہاں "پرے ہٹ" کی جگہ "اُدھر جا" پڑھا جائے تو نہ وہ
خوبی باقی رہے گی نہ زورِ بیان۔ مولانا راسخ دہلوی نے اس لفظ کو اپنی غزلوں
میں کثرت سے استعمال کیا ہے۔

(راسخ) چل پرے کر لمبی ہو میرے گھر سے ٹل فرقت کی رات
ہٹ پرے جا دور کالا منہ نکل فرقت کی رات

حضرتِ بیان یزدانی نے بھی اس لفظ کو نظم اور نثر دونوں میں استعمال کیا
ہے۔ حضرتِ داغ مرحوم نے اہلِ لکھنؤ کے پاس ملاقات سے کبھی یا فضول
اعتراضوں سے بچنے کے لیے دہلی کے کئی الفاظ کو بلا ذاتی وجہ کے ترک
کر دیا اور کئی الفاظ میں تذکیر و تانیث کا بھی تصرف کیا ہے جسے میں درست
نہیں سمجھتا اور حضرتِ اطہر ہاپوڑی بھی اس معاملہ میں میرے ہم خیال تھے۔
یہاں ایک واقعہ کا ذکر بے محل نہ ہو گا۔ مولوی عبدالباری صاحب آسی

متوطن قصبۂ الدن ضلع میرٹھ جو ایک عالم بھی تھے، کثیر التصانیف بھی اور لکھنؤ کے بڑے اساتذہ میں بھی جن کا شمار تھا جن کی تحقیق بھی قابلِ قدر ہے، میرے شاگرد اور دوست ہی نہیں عزیز بھی ہیں۔ آپ میرے اشعار کو عقیدت سے سنتے تھے اور میرے لیے سراپا دادِ سخن تھے۔ آپ نے میرے اشعار کو سن کر ایک مرتبہ نہایت خلوص کے ساتھ فرمایا کہ یہ یہ لفظ اور یہ یہ محاورے لکھنؤ میں نہیں اور لکھنؤ والے انہیں پسند نہیں کرتے اس لیے اگر آپ انہیں درست فرما لیجئے تو بہتر ہوگا۔ میں نے جواب دیا بھائی لکھنؤ کی سند نہیں تم یہ کہو کہ تمہارے گھر کی زبان کے بھی یہ الفاظ اور محاورات ہیں یا نہیں تو فرمایا کہ ہاں ہیں اور نہایت فصیح ہیں اس پر میں نے کہا تو پھر آپ لکھنؤ کے اثر سے اپنی زبان کو بدل لیجیے اور مجھے اپنے اثر سے دکن کی زبان بدلنے کے لیے چھوڑ دیجیے۔ لکھنؤ کی زبان تو یہ ہے کہ یہاں تعالیٰ اللہ کے محل استعمال میں معاذ اللہ بے تکلف بولا جاتا ہے، تم ایسا بولتے ہو۔ اس کے بیان سے مقصد یہ ہے کہ جب حضرت آسی کی جیسی ہستی پر ماحول کا اثر ہوئے بغیر نہ رہا جو نہایت سخت اور جھگڑالو مشہور تھے تو حضرتِ داغ کا متاثر ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں جو خاموش اور صلح پسند تھے۔ میں اپنے برادرانِ خواجہ تاش سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ ایسے الفاظ کے متعلق اپنی ذاتی تحقیق سے بھی کام لیا کریں۔
حضرتِ قدر گلاؤٹھوی بھی جو داغ کے ایک قدیم اور مایۂ ناز شاگرد۔ مجھے اس معاملہ میں میرے ہم خیال تھے اور حضرت رسا گلاؤٹھوی ثم الرامپوری بھی ہم سے متفق تھے۔

(۱۳) دل نہیں تجھ کو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار
اس چراغاں کا کروں کیا کار فرما جل گیا

جس کام کا کرنے والا نہ رہے اس کی حالت نگرانی نہ ہونے کی وجہ سے
آپ ہی آپ ابتر ہوجاتی ہے۔ کہتے ہیں میرے سینہ کے گلہائے داغ کی
بہار اور تابانی دیکھنے کے قابل تھی مگر اب کیا بتاؤں کہ جس ہستی کی حسنِ
کارگزاری سے اس میں چراغاں کا عالم پیدا ہوگیا تو داغوں کی بہار کس کے
بھروسہ پر باقی رہتی۔ یہاں ایک لطیفہ یاد آیا جس کا بیان دلچسپی سے
خالی نہ ہوگا۔ برطانیہ میں جب گھڑی کی ابتدا ہوئی تو ایک دیہاتی
انگریز نے بڑی دیوار گھڑی لاکر اپنے یہاں لگائی جو سال دو سال چلنے
کے بعد بند ہوگئی میم صاحبہ نے صاحب سے شکایت کی کہ گھڑی چلتی
نہیں تو صاحب نے گھڑی کو اُتار کر کھولا اور اسے غور سے دیکھا تو اتفاقاً
ایک چوہا مرا ہوا ڈائل کے نیچے انہیں نظر آیا یہ دیکھ کر صاحب بہادر میم صاحبہ
سے بولے کہ گھڑی چلے کیونکر اس کا تو انجینئر ہی مر گیا۔

(۴) ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اُٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

جنازہ اٹھنے میں تشہیر ہے اور قبر انگشت نمائی کے لئے نشان اگر
ہم یوں نہ مرتے اور کہیں بحرِ ظلمات میں جاکر ڈوب رہتے تو یہ
رسوائیاں کیوں ہوتیں، لارڈ کچنر کی طرح سب باتوں سے بے نیاز
ہوکر نہ سوتے[1]

(۵) یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

---

[1] لارڈ کچنر (۱۸۵۰ء تا ۱۹۱۶ء) یہ بہادر انگریز اپنے جہاز ہمپشائر (H.M.S. Hampshire) نامی جہاز کے ساتھ ہی غرقاب ہوگیا تھا جب کہ وہ کسی خاص مشن پر روس جا رہا تھا۔

اگر بادہ خواری کی بُری لت تجھے نگی ہوئی نہ ہوتی تو اے غالب تیرے بیان میں جو مسائلِ تصوّف ہوتے ہیں وہ ایسے ہیں کہ ہم تجھے ولی سمجھتے. بعض اصحاب غالب کے اشعار کی مسائلِ تصوّف سے تشریح کرتے ہیں جو اکثر میں نے بھی کی ہے اور بالکل اس بیان کے مطابق ہے لیکن یار لوگ اِس پر خواہ مخواہ کی نکتہ آرائی کا الزام بھی لگا دیتے ہیں. غالب مسائلِ تصوّف لکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں تو بھی تصوّف سے ان کے کلام کی شرح کرنے پر اعتراض ہوتا ہے لیکن انہوں نے اہلِ سیاست ہونے کا کبھی دعویٰ نہیں کیا اس پر بھی ڈاکٹر سیّد محمود صاحب نے ان کے بہت سے اشعار پر سیاستِ حاضرہ کے معانی کا جامہ پہنا دیا ہے مگر انہیں کوئی کچھ نہیں کہتا۔

(۴) کیا ہی رضواں سے لڑائی ہو گی
گھر تِرا خُلد میں گر یاد آیا ....

اس پر ایک قصہ یاد آیا میں سنہ۔ میں لکھنؤ گیا تھا گرمی کا موسم تھا، مولانا آسی کے وہاں مقیم تھا، وہ مجھے اپنے ایک دوست کے وہاں ملاقاتِ بازدید کے لیے لے گئے انہوں نے فالودہ سے تواضع کی جو کسی مشہور دوکان سے منگوایا گیا تھا۔ مجھے یہ فالودہ پسند نہ آیا مگر خاطرًا تعریف ضرور کی اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ بھوپال میں عرب کی دوکان کا فالودہ جس قدر نفیس ہوتا ہے ایسا ہندوستان بھر میں کہیں نہیں دیکھا۔ وہاں ایک صاحب قدیمی وضع کے دیرینہ سال بھی بیٹھے ہوئے تھے وہ یہ سُن کر بگڑ گئے اور بے ساختہ کہا واللہ قبلہ آپ بھی کیسی ناگوار باتیں کرتے ہیں۔ لکھنؤ کی نفاست تو دنیا بھر کو نصیب نہیں۔ اُس وقت اُن کے تیور کچھ ایسے تھے کہ اگر میں جواب

دینے کی جرأت کرتا تو یقیناً لڑ پڑتے ۔

(۷) عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

جس طرح قطرہ کے لیے سامانِ عشرت دریا میں فنا ہو جانا ہے کہ یہ جزو اپنے کُل میں شامل ہو کر کُل ہو جاتا ہے ۔

ع قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے

اسی طرح درد کے لیے بھی درد کا حد سے گزر جانا دوا ہو جانا ہے کہ فنا ہو کر مبدءِ ذات میں شامل ہو جاتے ہیں جو نہ صرف یہ کہ دوائے درد ہے بلکہ سامانِ عشرتِ دوام بھی ہے ۔

(ناطق) نجاتِ دہر کا باعث ہوا دورِ تسلسل سے
فنا جو ہو گیا کُل میں وہی جز بڑھ گیا کُل سے

میرے اس شعر پر لکھنؤ کے ایک پروفیسر صاحب نے جو خوش قسمتی سے ایک مشہور شاعر مرحوم کے صاحب زادے بھی ہیں یہ اعتراض کیا کہ "جز کل سے مسلماتِ علمی کے مطابق ہرگز نہیں بڑھ سکتا" جب مجھ تک ان کا یہ اعتراض پہونچا تو میں نے کہا کہ "شعر مرا بہ مدرسہ کہ برد" ۔ کاش پروفیسر صاحب کو یہ معلوم ہوتا کہ قافیہ "کل" کا "جز" کے مقابلہ کا نہیں ۔

(۸) افسوس کہ دنداں کا کیا رزق فلک نے
جن لوگوں کی تھی درخورِ عقدِ گہر انگشت

بعالمِ تعجب و حسرت و افسوس ! دانتوں میں انگلی دبانے کی رسم ہے ۔ "عقدِ گہر" ہونے کا اردو میں موزوں ترجمہ "سونے چاندی سے کھیلنا ہوگا ۔ موتیوں کے ساتھ دانتوں کو جو مناسبت ہے وہ ظاہر ہے ۔ یہ بات قرینِ قیاس ہونا چاہیے کہ اہلِ کمال سونے چاندی سے کھیلیں یعنی

وہ اہلِ دولت ہوں یہ نا قدر شناسیِ فلک یا جورِ زمانہ کی شکایت کرتے ہیں کہ افسوس! جو انگلیاں عقدِ گہر کرنے کے لائق تھیں، وہ دانتوں کا رزق ہو گئیں یعنی اہلِ کمال کو وقفِ حسرت و اندوہ کر کے رکھ دیا کہ وہ بہ عالمِ بے بسی دانتوں سے انگلیاں کاٹیں۔ میرے والد صاحب مرحوم خدا انہیں غریقِ رحمت کرے گو شاعری کم کرتے تھے لیکن ذوقِ سلیم ایسا رکھتے تھے کہ ہمیشہ نہ صرف بلحاظِ ادبِ پدری بلکہ بوجہ زورِ دلائل مجھے ان سے قائل ہونا پڑتا تھا ایک روز کا ذکر ہے کہ میں دیوان غالبؔ پڑھ رہا تھا حضرت بھی اتفاق سے تشریف لے آئے اور میرے ہاتھ سے دیوان لے لیا صفحہ وہی کھلا ہوا تھا جس پر یہ شعر ہے آپ نے پڑھ کر اوّل تو تعریف کی اس کے بعد مجھ سے کہا میاں بتاؤ اس میں غالبؔ نے کوئی غلطی تو نہیں کی ہے میں نے غور کیا اور جب مکرر سوال پر بھی میں خاموش ہی رہا تو فرمایا دیکھو شاعر کا مطلب یہ ہے کہ "فلک نے انگشت کو دانتوں کا رزق کیا" لیکن الفاظ ایسے استعمال کیے ہیں جن سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ خود ان لوگوں کو دانتوں کا رزق کر دیا جن کی انگشت درخورِ عقدِ گہر تھی میں نے کہا درست ہے۔ تو فرمایا جب تک سیاقِ بیان سے مطلب نکل آئے شاعر پر اعتراض کرنا نہیں چاہیے کہ وہ بڑی جگر کاوی سے لکھتا ہے اور بے خیالی سے کون غلطی نہیں کرتا اور کس نے غلطی نہیں کی ہے عیب ذات صرف اللہ کی ہے۔ آہ اے خاکِ گلاوٹھی کیسے پتھر پڑ گئے کہ اب تجھ سے پہلے کے ایسے باکمال لوگ پیدا نہیں ہوتے۔ میں اسی باپ کا کم مایہ بیٹا ہوں اور میرا بیٹا مجھ سے بہت زیادہ نا اہل ہے۔

(۹) فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے
متاعِ بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

متاعِ بردہ مالِ بہ غارت بردہ ۔ حالی نے اس کی شرح یوں کی ہے کہ یہ مضمون بالکل و توعیات میں سے ہے کہ جو لوگ آسودگی کے بعد مفلس ہو جاتے ہیں وہ ہمیشہ اپنے تئیں مظلوم ستم رسیدہ و فلک زدہ سمجھا کرتے ہیں اور اخیر دم تک اس بات کی توقع رکھتے ہیں کہ ضرور کبھی نہ کبھی ہمارا انصاف ہوگا اور ہمارا اقبال عود کرے گا شرح بالکل درست ہے۔ اس لئے میں صرف وضاحت کے لیے اس شعر کو بدل کر یوں لکھ دینا چاہتا ہوں۔ طلب کرتے ہیں انگلستان سے ہم اپنی آزادی
متاعِ بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

اسی مضمون کو ذرا اندازِ بیان بدل کر مصنّف نے دوسری جگہ بہت خوبی کے ساتھ لکھا ہے۔ ملاحظہ ہو۔ (غالبؔ) گردشِ رنگِ طرب سے ڈر ہے غمِ محرومیِ جاوید نہیں

(۱۰) ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارفؔ
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

مرحوم سے خطاب کرتے کرتے خیال آیا کہ یہ ستم آسمان نے توڑا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ بیچارا اگر کوئی دن اور زندہ رہ کر لطفِ شباب اُٹھاتا تو تیرا کیا بگڑ جاتا۔ عارفؔ مرحوم کا تخلّص ہے اور نام زین العابدین خان، یہ مصنّف کے شاگرد بھی تھے اور عزیز بھی اگر میری یاد غلطی نہیں کرتی تو یہ کسی رشتہ سے غالبؔ کے سالے ہوتے تھے۔ کہتے ہیں کہ خوش گو

لے عارفؔ، غالبؔ کے سالے نہیں بلکہ ان کی سالی بنیادی بیگم کے فرزند تھے ۔ عارفؔ کا کلام تا حال نہیں چھپا مگر اس کے دیوان کے کئی قلمی نسخے دستیاب ہیں۔ چند تذکروں اور دوسری کتابوں میں بھی چند اشعار دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔

بھی تھے اور ضرور ہوں گے کہ غالبؔ جیسا شخص ان کے لیے ماتم کرتا ہے لیکن ان کا کوئی شعر میری نظر سے نہیں گزرا۔

(۱۱) غم اس کو حسرتِ پروانہ کا ہے اے شعلہ
ترے لرزنے سے ظاہر ہے ناتوانیِ شمع

اے شعلے ترے لرزنے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ شمع کو حسرتِ پروانہ کا غم ہے جس سے وہ ایسی ضعیف و ناتواں ہوگئی ہے کہ تجھے بھی نہیں سنبھال سکتی۔ یہاں اے شعلہ کا طرزِ بیان اگر اردو سمجھا جائے تو ہمارے مختفی ہ سے غلط ہوگا لیکن اے جس طرح اردو کا لفظ ہے فارسی کا بھی ہے اس لیے جہاں اے شعلہ فارسی کا صحیح طرزِ بیان ہوگا وہاں اردو ہو کر اے شعلہ بھی درست ہوگا کہ ترکیبِ فارسی موجود ہے میرے اس شعر پر سے

(ناطق) پتہ تو کوچۂ گیسو سے لانا اب کے چکر میں
وہاں میرا دلِ گم گشتہ بھی اے شانہ آتا ہے

مولانا آسیؔ لکھنوی نے "اے شانہ" کے لیے بھی اعتراض کیا تھا اور میں نے یہی جواب دے دیا لیکن یہ سوچ کر کہ دوسرا کون مجھ سے پوچھنے آئے گا اور میں کس کس کو جواب دے سکوں گا میں نے اپنے شعر کو غزل سے نکال دیا۔

(۱۲) ترے خیال سے روح اہتزاز کرتی ہے[1]
بہ جلوہ ریزیِ باد، و بہ پر فشانیِ شمع

اہتزاز کرنا بہ عالمِ سرور وجد میں آنا جھومنے لگنا۔ یہاں روح کے خیالِ یار

---

[1] صحیح لفظ اہتزاز ہے۔ معتبر نسخوں میں بھی اہتزاز اور اہتراز دونوں طرح لکھا ملتا ہے مگر دونوں غلط ہیں۔

سے احتراز کرنے کو جلوہ ریزیِ بادو پرفشانیِ شمع سے تشبیہ دینا مقصود ہے کہ شعلۂ شمع کی زندگی ہوا پر منحصر ہے۔ اگر اس کے ماحول میں ہوا نہ ہو تو شمع بجھ جاتی ہے۔ مصنفؒ نے اس بات کو لفظِ قسم سے ادا کیا جس سے لطفِ بیان بہت بڑھ جاتا ہے۔ یہاں "بہ جلوہ" میں بہ قسمیہ ہے[1] کہتے ہیں قسم ہے ہوا کی جلوہ ریزی کی اور قسم ہے پرفشانیِ شمع کی کہ تیری ہوائے خیال سے روح وجد میں آجاتی ہے۔ یہاں دوسرا مصرعہ پورا فارسی کا ہے اس لیے سب کچھ درست ورنہ اردو میں سوائے واللہ باللہ کے نہ بہ کا برائے قسم استعمال ہے نہ واو کا۔ بلکہ ان دونوں میں بھی باللہ کو خواص ہی بولتے ہیں البتہ واللہ عام ہے۔

(۱۴۳) غالبؔ اپنا بھی عقیدہ ہے بقولِ ناسخؔ

آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ نہیں

(ناسخ) شبہ ناسخؔ نہیں کچھ میرؔ کی استادی میں

آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ نہیں

مراد میر تقی میرؔ سے ہے جو ہر زمانے اور ہر طبقے میں اردو کے مسلم الثبوت شاعر اور استاد مانے گئے ہیں۔ میرؔ کا خاندان اس وقت گلاؤٹھی میں ہی پایا جاتا ہے یہ لوگ جامع مسجد کے عقب میں آباد ہیں مگر یہ پتہ نہیں چلتا

---

[1] بہ قسمیہ حقیقت میں اب قسمیہ ہے۔ مدعا گویہ بجلوہ ریزیِ بادو بپرفشانیِ شمع پڑھنا چاہیے تب قسمیہ کا استعمال اردو میں بھی ہے مگر کم ہے جیسے ــــ وہ بھی ہے ذوالفقار کی زد میں بمرتضےٰ (یعنی علی مرتضےٰ کی قسم) یا انیسؔ کا شعر ــــ

یہ مرض وہ ہے کہ دنیا میں نہیں جس کی دوا

یہ ہے وہ زخم کہ مرہم نہیں جس کا بخدا (یعنی خدا کی قسم)

کہ کب یہ لوگ وہاں آکر آباد ہوئے اور میر سے ان کے اجداد کی کیا نسبت تھی۔

(۱۴) ہیں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ رقیب سے
ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں

پہلا مصرعہ استفہام انکاری ہے۔ کہتے ہیں وصل میں میرے اضطرابِ شوق کو دیکھ کر وہم نے تمہیں کس پیچ و تاب میں ڈال دیا اجی گھبراتے کیوں ہو میں خوفِ آمدِ رقیب سے مضطرب نہیں وہ یہاں کیا کھا کر آئے گا۔

(داغ) اضطرابِ شوق کا عالم کہوں کیا اس گھڑی
جب کسی کا فرکے وا بندِ قبا ہونے لگے

مولانا شوکت میرٹھی نے جہاں غالب کے ساتھ اور بہت سی ناانصافیاں کی ہیں۔ وہاں اس شعر کے متعلق بھی آپ فرماتے ہیں کہ غالب نے یہ غزل جس مشاعرے میں پڑھی تھی اس میں امام بخش صاحب صہبائی بھی تشریف رکھتے تھے۔ جنہوں نے مشاعرے کے بعد مصنف سے پوچھا کہ "تم نے اس شعر پر کیا معنی پہنائے ہیں" تو غالب نے جواب دیا کہ "مولانا آپ ان باتوں کو کیا جانیں نہ کسی کے عاشق بنے نہ معشوق میں نے تو اس میں اپنا ایک واقعہ نظم کیا ہے کہ ایک خانگی سے مجھے رابطہ ہو گیا تھا اسے کسی بہانے ڈھب پر چڑھایا مگر آمدِ رقیب کے خوف سے شہوت غائب ہو گئی اس نے خیال کیا کہ غالب نامرد ہے میں نے اس کے دفعیہ کے لئے یہ شعر پڑھا"۔ بہت ممکن ہے کہ ایسا ہوا ہو اور مصنف نے اپنی حاضر جوابی اور شوخ طبعی کی بنا پر مولانا صہبائی کو یہ جواب دے دیا مگر اس سے شعر پر کوئی آنچ نہیں آتی۔ اس شعر کا یہ زیادہ موزوں مطلب ہوگا کہ معشوق کو وصل میں خوف رقیب ہے وہ گھبرا رہا ہے کہ

کہیں آنہ جائے اس کی تسلی کے لیے کہتے ہیں کہ تمہیں اس وہم نے کسی پیچ وتاب میں ڈال رکھا ہے جس سے میں پریشان ہو رہا ہوں (یہاں اس کا گزر کہاں)۔

(۱۵) سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں[1]
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

زنہار قدم بخاک آہستہ نہی — کیں مردمکِ چشمِ نگارے بودست[2]

---

[1] یہ مضمون نیا نہیں مگر غالب نے اِسے بہترین صورت عطا کی ہے۔

[2] یہ شعر کسی رباعی کا معلوم ہوتا ہے مگر خبر نہیں کس کا ہے، تاہم عمر خیام کی ایک رباعی بھی اِس مضمون کی ہے:

در ہر دشتے کہ لالہ زارے بودست — آں لالہ زخونِ شہریارے بودست
ہر برگِ بنفشہ کز زمیں می روید — خالے ست کہ بر روئے نگارے بودست

اس مضمون کے اور بھی کئی شعر پیشِ نظر ہیں ملاحظہ فرمائیں

خسروؔ — اے گُل چو آمدی اززمیں گو چگونہ اند — آں روئے ہا کہ درتہ گردِ فنا شدند
بیدلؔ — خلقے بہ عدم دودِ علم و داغِ جگر برد — خاک ہمہ صرفِ گُل و سنبل شدہ باشد
میرؔ — ہیں مستحیل خاک سے اجزائے نوخطاں — کیا سہل ہے زمین سے کھلنا نبات کا
ہر قطعۂ چمن پہ ٹک گاڑ کر نظر کر — بگڑیں ہزار شکلیں تب پھول یہ بنائے
گُو گُل و لالہ کہاں سنبل سمن ہم نسترن — خاک سے یکساں ہوئے ہیں ہائے کیا کیا آشنا
سوداؔ — گئے جہان سے کیا کیا ستیزہ روتہِ خاک — کہ گل عدم سے جو آیا بہت نگار آیا
ناسخؔ — ہو گیے دفن ہزاروں ہی گل اندام اس میں — اس لیے خاک سے ہوتے ہیں گلستاں پیدا
نظیرؔ — تھے کل یہ خطِ عارضِ خوبانِ سبز رنگ — کہتی ہے آج خلق جنہیں سبزہ زار ہا

جناب ناطق مرحوم کا اس مضمون کا شعر صفحہ ۸۰ پر ملاحظہ کیجیے۔ تفنّنِ طبع کے لیے راقم بھی ایک پرانی غزل کا یہ شعر پیش کرنے کی جسارت کرتا ہے:

وہی جمال، وہی رنگ، تمکنت بھی وہی — یہ پھول نکلے زمیں سے کہ نازنیں نکلے

کہتے ہیں لالہ و گل کی نمائش ان صورتوں کا عکس ہے جو خاک میں پنہاں ہوئی ہیں اور وہ بھی سب نہیں کچھ۔

(ناطق)
فلک یہ چند گل بوٹے جو نکلے بھی تو کیا نکلے
گئی جو خاک میں وہ اچھی صورت پھر نہیں نکلی

(۱۶)
واں وہ غرورِ عز و نازیاں یہ حجابِ پاسِ وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلائے کیوں

ہمیں پاسِ وضع کی شرم راہ میں ٹوکنے سے روکتی ہے اور انہیں عزت اور ناز کا گھمنڈ بزم میں بلانے سے مانع ہے "چلیے نہ تم خالی نہ ہم خالی" اب سے پہلے شرفا، راستے میں کسی کو مل کر ٹوکنے یا سرِ راہ کھڑے ہو کر باتیں کرنے کو معیوب سمجھتے تھے۔ چنانچہ میر تقی میر کا قصہ مشہور ہے کہ جب انہوں نے دربار کی کسی بات سے ناراض ہو کر خانہ نشینی اختیار کر لی تھی تو ایک روز شاہ اودھ خود انہیں لکھنؤ کے بازار میں گزرتے ہوئے مل گیے بادشاہ نے کچھ گفتگو کرنا اور کشیدہ ہو جانے کی وجہ پوچھنا چاہا تو میر نے یہ جواب دیا کہ راستہ میں باتیں کرنا شرفاء کی وضع نہیں۔

(۱۷)
غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا کیجیے ہائے ہائے کیوں

کہا کرتے ہیں کہ آدمی آدمی کے لیے نہیں رویا کرتا بلکہ اپنے آرام کے لیے روتا ہے اور یہ بھی محاورہ ہے کہ "فلاں شخص کے بغیر کون سے کام بند ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ اگر غالب مر گیا ہے تو اس کے لیے کیوں روئیے اور کیوں آہیں بھریئے۔ آخر وہ تھا کس کام کا مر گیا جانے دو۔ اگرچہ یہ بات شرح سے متعلق نہیں لیکن دل نہیں مانتا اس لیے لکھے دیتا ہوں کہ گو یہ غزل مرزا غالب کی بہترین غزلوں میں سے ہے لیکن استادی حضرت مرزا داغ دہلوی نے بھی جو اس پر طبع آزمائی

کی ہے وہ نہایت ہی قابلِ قدر ہے اور ان کی پوری غزل غالبؔ کی غزل کے بالکل ہم پلّہ ہے کہ اگر اُس کے اشعار اس میں شامل کر دیئے جائیں تو کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ غالبؔ کے اشعار نہیں۔ مثال کے طور پر مختصراً میں صرف دو شعر لکھے دیتا ہوں۔

(۱) عشق و جنوں سے مجھ کو لاگ ہوش و خرد سے اتّفاق
پر یہ کہوں تو کیا کہوں میں نے ستم اٹھائے کیوں

(۲) جرأتِ شوق پھر کہاں وقت ہی جب نکل گیا
اب تو ہیں یہ ندامتیں صبر کیا تھا ہائے کیوں

کہاں ہیں معترضینِ داغؔ، داغؔ کی اس غزل کو دیکھیں اور بتائیں کہ غالبؔ کے مقابلہ میں یہاں کس بات کی کمی ہے یہ بات اور ہے کہ داغؔ کا رجحانِ طبع روزمرّہ اور محاورات کی طرف تھا جن کے بیان میں انہوں نے ملکِ سخن پر تنہا حکمرانی کی ہے اور انسانی زندگی کے ہر شعبہ کو اپنی خوش بیانی میں لے لیا ہے داغؔ کے وہاں بازاری اشعار بھی کچھ ہیں لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ بھی وقت اور موقع کی ضرورت کو پورا کرتے ہیں اور انسانی زندگی کے اس ضروری شعبہ پر بھی حاوی ہو جاتے ہیں داغؔ کے وہاں عالی خیالی کی بھی کمی نہیں مگر معترضینِ داغؔ دوسرے اساتذہ کو بڑھانے کے لیے جو بے انصافیاں داغؔ کے ساتھ کرتے رہے ہیں اسے صرف تنگ نظری کہا جا سکتا ہے مجھے اس معاملہ میں کسی دوسرے معترض کا گلہ نہیں لیکن تعجب ہوتا ہے جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ مولانا حسرتؔ موہانی کی جیسی ہستی بھی داغؔ کے محاسن کی طرف سے منہ پھیرے ہوئے ہے اور ان کی خوبیوں کو برائیاں بتا کر پیش کر رہی ہے۔ ثاقبؔ کانپوری نے داغؔ کے ساتھ جو بے انصافیاں کی تھیں ان کا "شہابِ ثاقب" لکھ کر میں ایسا جواب

دے چکا ہوں جس کا جواب کافی عرصہ گذر جانے پر بھی اب تک نہیں ہوا لیکن افسوس ہے کہ مولانا حسرت موہانی کا میں احترام کرتا ہوں اور ان کے مقابلہ میں قلم اٹھانا پسند نہیں کرتا کاش کبھی مجھ سے اور ان سے دو بدو گفتگو کی نوبت آئے۔ آخر میں داغ کا ایک شعر اور لکھ کر میں اس بحث کو ختم کرتا ہوں ملاحظہ کیجیے کیا لکھا ہے.

(داغ) چکر میں مثلِ سنگ فلاخن ہوں دیکھیے
پھینکے مرے نصیب کی گردش کہاں مجھے

(۱۸) غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسے کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

میرے سوال کے جواب میں جو تم بوسے کا انداز دور سے کلی کو دکھا کر بتاتے ہو اس کی سند نہیں اجی پاس آؤ اور بوسہ لے کر بتاؤ کہ یوں لیا جاتا ہے. یا میں تمہارا بوسہ لیتا ہوں لینے دو اور بتاؤ کہ کیا اسی طرح بوسہ لیا جاتا ہے۔ بوسہ کے لین دین کو میں نے ترک کر دیا ہے۔

(ناطق) نہ اپنی شاعری کی دسترس ہے بندِ محرم تک
نہ آتا ہے ہمیں مضمون ناطق بوسہ بازی کا

مگر اس میں بھی شک نہیں کہ غالب کا یہ شعر ایسا ہے جس پر ان کا منہ بھی چوما جاتا اور ہاتھ بھی۔ اس زمین میں حضرت بیان ویزدانی کا مطلع بھی ملاحظہ کیجیے۔

آئے گا حشر کس طرح اُس نے بتا دیا کہ یوں
بندِ قبا کو کھول کر سامنے آگیا کہ یوں

بیان نے بھی کوئی بات ضرور پیدا کی ہے مگران کا مطلع کچھ زیادہ غیر ثقہ ہے اور
اس میں اتنا فرق نیز یہاں کے وہاں اور غالب کے مطلع میں، کچھ کم، ردیف ثانی
محل نظر ہے۔ اس میں اپنا مطلع پیش کرتا ہوں ؎

(ناطق) چارہ گروں میں بحث تھی کیجئے یوں دوا کہ یوں
میں نے بھی آج کھا کے زہر اُن کو بتا دیا کہ یوں

اس پر جو آپ کے جی میں آئے کہیئے لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ ردیف کوئی
بے کار نہیں۔

(۱۹) یعنی بہ حسبِ گردشِ پیمانۂ صفات
عارف ہمیشہ مست مئے ذات چاہیئے

عارفِ حقیقت کو چاہیئے کہ مئے ذات کی جس پیمانۂ صفت میں گردش
ہو اُسی سے مست ہو جائے ....
.... کتب تصوف میں لکھا ہے کہ شیخ محی الدین ابن العربی اندلسی
کہا کرتے تھے کہ "تمام عالم بوجود واحد موجود ہے اور اس کی حقیقت ایک
ذاتِ واحد کو سمجھو جو کچھ فرق نظر آتا ہے وہ محض اعتباری ہے"۔ ہم عصر علماء
سے اس پر بحثیں ہوئیں لیکن کوئی پار نہ پاسکا تو آخر ایک روز یار لوگوں
نے صلاح کی اور کسی دوست کے وہاں شیخ کی دعوت کی گئی جب آپ
ہاتھ دھو چکے تو جہاں اور اصحاب کے لیے اچھی غذائیں چنی گئیں وہاں ان
کے سامنے غلاظت کی بھری ہوئی ایک رکابی لا کر رکھ دی گئی۔ شیخ نے
میزبان کی طرف سر اُٹھا کر دیکھا تو اس نے مسکرا کر کہا "بسم اللہ کیجیے —
سب کھانے بوجود واحد ہیں فرق محض اعتباری ہے اس پر آپ نے
چادر سے سر ڈھانک کر جو منہ کھولا تو ایک خنزیر کی شکل نمودار ہوئی
اور تمام غلاظت کو صاف کر گئی پھر چادر ڈھانکنے کے بعد جو شیخ نے

منہ کھولا تو فرمایا کہ "ہر حیثیت کا تعلق ایک ہی حیثیت سے نہیں"
مگر اس قصے اور غالبؔ کے قطعہ سے معارفؔ کی خصوصیت ہے
ما و شما کا یہ مقام نہیں۔

(۲۰) بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے باندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی

دل کی ساخت اُلٹی صنوبری ہے۔ کہتے ہیں عجز کے وجود کی دنیا میں مثال صرف ایک ہمارے دل کی بساط تھی مگر وہ بھی کیا ایک خون کا قطرہ اوندھا لٹکا ہوا جو گرنے پر آمادہ ہے۔ یعنی دنیا میں عجز کا وجود اوّل تو ہے ہی نہیں اور اگر ہے بھی تو ایسا کم کہ ختم ہوا چاہتا ہے۔ دورِ حاضر کے ایک مشہور شاعر کے متعلق جن کا نام میں لکھنا نہیں چاہتا مجھ سے اور ایک مشہور ادیب سے گفتگو ہوئی میں نے کہا کہ وہ چور ہے اور ہوشیاری کے ساتھ دوسروں کے خیالات کو اپنے الفاظ میں بدلتا ہے انہوں نے کہا کہ ایسا ہو بھی سکتا ہے میں نے جواب دیا یقیناً تو انہوں نے مجھ سے کہا آپ ہی یہ کام کر کے بتائیے میں نے جواب دیا کہ کسی کی کوئی غزل دے دیجیے اور کوئی زمین بھی دے دیجیے تو میں یہیں بیٹھے بیٹھے لفافے بدل کر انہیں مضامین کو پیش کیے دیتا ہوں انہوں نے غالبؔ کی یہ غزل مجھے دی اور میں نے وہیں تعمیلِ ارشاد کر دی چنانچہ جو اشعار لکھے گیے وہ پیش کیے دیتا ہوں ؎

(ناطقؔ) سمجھ لو اڑ گیا رنگ وفا گلزارِ عالم سے
یہ کس گنتی میں مرجھائی ہوئی سی اک کلی دل کی

(غالبؔ) رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے
تکلف برطرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

تکلّف سے بناوٹی طور پر۔ تکلّف برطرف صاف بات یہ ہے کہ

(ناطق) نرالی مصلحت سوجھی ہے دل کو یہ بھی کیا دل ہے
اب ان سے بھی خفا ہے واہ رے آشفتگی دل کی

(غالبؔ) خیالِ مرگ کب تسکیں دلِ آزردہ کو بخشے
مرے دامِ تمنا میں ہے اک صیدِ زبوں وہ بھی

صیدِ زبوں بے حقیقت شکار۔ ظاہر ہے کہ بودا پکڑنے سے شکاری کو تسکین نہیں ہو سکتی۔ کہتے ہیں یہاں یہ عالم تمنا موت کا خیال بھی ایسا تو ی ہو کر نہیں آتا کہ میرے لیے باعثِ تسکین ہو جائے۔

(ناطق) بیانِ وصل پر بس ہو گیا کیا ذکر ناکامی
نہیں مرنا بھی بس کی بات اُف رے بےبسی دل کی

(غالبؔ) نہ کرتا کاش نالہ مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدم
کہ ہوگا باعثِ افزائشِ دردِ دروں وہ بھی

نالہ تو اس خیال سے کیا تھا کہ اس سے کچھ تسکین ہو گی مگر ہوا یہ کہ ناطاقتی نے زور پکڑا اور درد بڑھ گیا۔

(ناطق) حقیقت کھل گئی نالہ کی جب دردِ جگر چمکا
بہت پچھتا رہا ہے دیکھیے آنکھ اب کھلی دل کی

(غالبؔ) نہ اتنا برشِ تیغ جفا پر ناز فرماؤ
مرے دریائے بیتابی میں ہے اک موجِ خوں وہ بھی

مرا دریائے بیتابی جو حسرتوں کا خون ہونے سے پیدا ہوا ہے اس کی ہر موج تمہاری تیغِ جفا کی روانی دکھاتی ہے۔ یعنی تمہیں جس تیغِ جفا پر ناز ہے ایسی ہزاروں تلواریں مرے دل پر چل رہی ہیں۔

(ناطق) بنی تیغ جفا ہر موج اس دریائے احمر سے
کیا خوں اُس نے دل کا خون جو حسرت ہوئی دل کی

"فرماؤ" کا استعمال اب درست نہیں یا تو "کہو کہا جائے گا" یا "فرمایئے"۔

(غالبؔ) مئے عشرت کی خواہش ساقیِ گردوں سے کیا کیجے
لیے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی

ایک دو چار سات آسماں ۔ آسمان اوندھے پیالہ سے مشابہ ہے جس میخانہ میں صرف چند اوندھے پیالے پڑے ہوں وہاں کے ساقی سے شراب کی توقع لاحاصل ۔

(ناطق) خیالِ ساغرِ خالی بھی سامانِ تکلّف ہے
تکلّف برطرف دیکھو ذرا یہ سادگی دل کی

(۲۱) درد سے میرے ہے تجھ کو بیقراری ہائے ہائے
کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

اس غزل کے تین اشعار رنگِ تغزّل سے جدا ہیں جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ پوری غزل کی غزل مرگِ معشوق پر بسطورِ مرثیہ لکھی گئی جسے ان کی ہمدردی نے ختم کر دیا ہے اس لیے تمام اشعار کی تشریح اس انداز سے کی جاتی ہے اس غزل کو اگر مومن خان کے مرثیہ کی طرح بیانِ واقعہ سمجھا جائے تو غلط ہوگا کیونکہ غالبؔ نے عمر بھر ایسے جھگڑے نہیں پالے یہ رندِ مے نواز و سخن پرست نہ کبھی شاہد پرستی کا مرتکب ہوا نہ کبھی آوارہ گردی کی مولانا شوکت میرٹھی نے "میں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ رقیب سے ۔ ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں" کے متعلق جو قصہ لکھا ہے اس

ل‍ے یہ درست نہیں۔

کا کسی اور واسطے سے پتہ نہیں چلتا اس لیے ہمیں اوّل تو اس کی صداقت ہی میں شک ہے لیکن اگر سچ بھی ہو تو یہ محض غالبؔ کی حاضر جوابی کا بدرجۂ کمال ثبوت ہونے میں پیش کیا جا سکتا ہے کیونکہ جب مولوی امام بخش صاحب صہبائی جیسا فاضل اور قادر الکلام سخن فہم بزرگ ایک ایسے صاف شعر کے لیے یہ سوال کر بیٹھے کہ "مرزا نوشہ تم نے اس پر کیا معنی پہنائے ہیں" تو اس کا یہی بہترین جواب ہو سکتا ہے جو دے دیا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی غمزدہ کی فرمائش پر چند اشعار اپنی زبان میں لکھ دیے گیے یا جو اشعار انہوں نے مرگِ عارفؔ کے سلسلے میں لکھے ممکن ہے کہ انہیں کی باقی کڑیاں یہ بھی ہوں[1]۔

(۲۲) ہم سے رنجِ بیتابی کس طرح اٹھایا جائے

داغ پشتِ دستِ عجز شعلہ خس بہ دنداں ہے

داغ مصنّف کے خیال کے مطابق دھوئیں سے پیدا ہوتا ہے جس کے متعلق لکھ آئے ہیں۔

(غالبؔ) آشفتگی نے نقشِ سویدا کیا درست

ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا

جب داغ دھوئیں سے بنا اور دھواں پریشان ہوتا ہے تو داغ پریشانیوں کا مجموعہ ہو گیا جسے بیتابی بھی کہتے ہیں۔ خس بدنداں ہونا اظہارِ عجز کی قدیم رسم ہے جس کے متعلق لکھ آئے ہیں۔

(غالبؔ) نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کو

لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیئستاں کا

---

[1] ان اشعار پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ ان کا مرگِ عارفؔ سے کوئی تعلق نہیں

- -

- - - - - - - مصنّف نے اس کا مطلب یوں بیان کیا کہ " پشتِ دستِ عجز اور حسن بدنداں گرفتن بھی اظہارِ عجز ہے پس جس عالم میں کہ داغ نے پشت زمین پر رکھ دی ہو اور شعلہ نے تنکا دبا لیا ہو ہم سے رنج و اضطراب کا تحمّل کس طرح ہو۔ مصنّف نے اپنے ایک خط میں ان اشعار کے متعلّق یہ لکھا ہے کہ " یہ اس دیوان کا بقیہ نمونہ ہے جو تمیز آنے کے بعد خود مصنّف نے دور کیا اور سب شعر یک قلم چاک کر ڈالے " غالب کی اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد انہیں ایسے اشعار کی نسبت اپنی طرف منظور نہیں رہی مگر بدقسمتی سے جب زمانے نے غالب پرستی اختیار کی تو ان کے اس کلام کی بھی تلاش ہوئی جسے مرزا نے اپنے الفاظ میں دور کیا تھا اور ان کے یہ الفاظ کہ " جب تمیز آئی " صاف بتا رہے ہیں کہ انہوں نے اس کلام کو ایک طوفانِ بے تمیزی سمجھا تھا۔ ہوتا یہ ہے کہ شاعر زمانۂ مشق میں اوّل سے آخر تک اپنے اشعار کو پیش کرتا رہتا ہے جس کی نقلیں بھی لوگوں کے پاس موجود ہوتی ہیں چنانچہ جوئندہ یابندہ غالب کے پہلے والے مجموعہ کی ایک نقل نواب حمید اللہ خاں صاحب فرماں روائے بھوپال کو اپنے زمانۂ ولیعہدی میں ریاست کے کتب خانے کے اندر مل گئی اور ایک نسخہ مولانا عبدالباری صاحب آسی کے ہاتھ آیا[۱] جو دونوں کے دونوں چھپ چکے ہیں بلکہ مولانا آسی نے تو اس کی شرح بھی کی ہے میرے نزدیک یہ سب کلام غالب سے منسوب بھی کیا

---

[۱] اب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ یہ کلام جعلی ہے اور خود آسی مرحوم کے دماغ کی اُپج ہے۔

جاسکتا ہے اور نہیں بھی اس طرح کہ اس کی خوبیوں کی داد مزور انہیں
دی جاسکتی ہے لیکن عیوب کے وہ ذمہ دار نہیں کہ خود اسے اپنے
کلام سے علیحدہ کر چکے تھے۔ غالبؔ کے متعلق یہ بھی مشہور ہے کہ آپ
مشق سخن کی ابتدا میں کچھ غزلیں میر تقی میرؔ کی خدمت میں لے کر حاضر ہوئے
تھے جنہیں دیکھ کر انہوں نے کہہ دیا کہ اگر اس لڑکے کو کوئی اچھا
استاد مل گیا تو بڑا اچھا شاعر ہو گا ورنہ مہمل بکنے لگے گا مگر چونکہ خود میرؔ نے
انہیں اصلاح نہیں دی اس لیے غالبؔ چند بے معلقات ہی لکھتے
رہے جنہیں مہمل گوئی کہئے یا کچھ اس کے بعد جو لوگوں کے اعتراضات پر
خیال کیا تو یہ لکھا۔

(غالبؔ) مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
سن سن کے اسے سخن ورانِ کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگر نہ گویم مشکل

پھر سنبھلے تو وہ کچھ لکھا کہ دنیائے شاعری میں سکہ جمالیا اور آسان
بھی لکھا تو ایسا کہ بہت سے اشعار سہل ممتنع ہو کر اردو کے روزمرہ
میں شامل ہو گیے ہیں۔ اور روزانہ گفتگو میں کثرت سے پڑھے جاتے
ہیں۔

(۲۴) اُن کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

سقیم الحال کی اطلاع پا کر جب وہ دیکھنے کو آتے ہیں تو انہیں دیکھ کر
میرے منہ پر رونق آجاتی ہے چہرہ پر رونق دیکھتے ہیں تو سمجھتے ہیں
کہ اس کا حال اچھا ہے۔ بیمار نہیں۔ مصنف کا یہ شعر بے حد مقبول ہے

مجھ سے منشی ممتاز علی صاحب آہ امیٹھوی نے جو امیر مینائی کے ارشدِ تلامذہ میں سے تھے اور جو دفتر امیر اللغات کے پہلے سکریٹری بھی تھے بیان کیا کہ اس زمین میں جب امیر مینائی نے غزل لکھی ہے تو آپ بتاتے جاتے تھے اور میں لکھتا جاتا تھا جب حال کے قافیہ پر آئے تو کئی شعر لکھائے لکھاتے تھے اور پھر اسی پر فکر کرتے تھے میں نے کہا کہ حضرت اب تو اس میں کئی شعر نکل آئے اور خوب خوب ہو گیے مزید فکر کی ضرورت نہیں اس پر انہوں نے زانو پر ہاتھ مارا اور یہی شعر پڑھا۔ دیگر اساتذہ نے بھی اس قافیہ پر بہت زور لگایا ہے۔ حضرت داغ مرحوم کا شعر بھی سہل ممتنع اور بیت الغزل ہے

(داغ) آپ گھبرائیں نہیں جور سے توبہ نہ کریں
آپ سمجھتائیں نہیں داغ کا حال اچھا ہے

وہ عیادت کے لیے آئے ہیں لو اور سنو
آج ہی خوبیِ تقدیر سے حال اچھا[1] ہے

"ان کے دیکھے سے" جو یہاں مصنف نے لکھا ہے اور جس سے مطلب ان کو دیکھنے سے ہے اب اس طرح نہیں بولا جاتا یہ لفظ اب خود ان کے دیکھنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

(۲۴) میں جو گستاخ ہوں آئینِ غزل خوانی میں
یہ بھی تیرا ہی کرم ذوق فزا ہوتا ہے

مگر اس کا سبب یہ ہے کہ تیرا خیالِ کرم میرے ذوق کو بڑھا دیتا ہے۔

---

[1] "حال اچھا ہے" یعنی مرض میں کچھ افاقہ ہے یا طبیعت کو کچھ سکون ہے۔ "حال اچھا ہے" اپنی جگہ پر مکمل ٹکڑا ہے۔ "حال اچھا ہونا" کو اس کا ماخذ سمجھ کر کسی اور طرح سے اس کا استعمال مستحسن نہ ہو گا۔

(غالب) ادائے خاص سے غالبؔ ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

(۲۵) رکھیو غالبؔ مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

میری آج کی تلخ نوائی کا سبب دردِ دل کی زیادتی ہے غالبؔ تمہیں اس سے تکلیف ہوئی ہو تو معاف کرنا۔ غزل کے باقی اشعار کو تلخ نوائی سے کوئی واسطہ نہیں بلکہ یہاں مدح سرائی بھی ہے اس لیے سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا اشارہ کس طرف ہے۔ جواب یہ ہے کہ غزل کا ہر شعر آزاد ہوتا ہے جو حسبِ موقع استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک صاحب نے مجھ سے بیان کیا کہ مقطع اور اوپر کا شعر حضرتِ ذوقؔ اور بادشاہ پر چوٹ ہے۔ مطلب یہ کہ تیرا دہ کرم جس نے ذوقؔ کو بڑھا دیا آئینِ غزل خوانی میں میرے گستاخ ہونے کا سبب ہے کیونکہ مجھے تیری سخن نافہمی کا یقین ہو گیا اور مقطع کی تلخ نوائی میں بھی اس کا بیان ہے۔ درد سوا ہوتا ہے کا یہ مطلب ہے کہ آج کچھ زیادہ جی دکھا ہوا ہے۔ اس پر صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ یار لوگوں نے لفظِ ذوق سے اپنی بد ذوقی کا ثبوت دیا۔

(۲۶) ....

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پوچھ مت وجہِ سیہ مستی اربابِ چمن
سایۂ تاک میں ہوتی ہے ہوا موجِ شراب
ہے یہ برسات وہ موسم کہ عجب کیا ہے اگر
موجِ ہستی کو کرے فیضِ ہوا موجِ شراب

ایک مرتبہ جناب جگرؔ مرادآبادی ناگپور تشریف لائے لوگوں نے مجھے

مجبور کیا کہ چل کر ان سے مل لیجیے احباب کے خوش کرنے کے لیے جانا پڑا دیکھا کہ لوگ گھیرے ہوئے ہیں اور جگر صاحب بے تکلفی سے مے نوشی میں مشغول ہیں مکان میں ہوا کا گزر نہ تھا اور میں ایک عرصہ سے اختلاج کا مریض ہوں بہت کوشش کی کہ لوگ ہٹ جائیں لیکن جو موجود تھے وہ تو نہ ٹلے اور بھی بہت سے آگیے کہ دیکھیں باہم کیا گفتگو ہوتی ہے مجھے اس سے تکلیف ہونے لگی اور تنفس بڑھ گیا تو میں نے کہا کہ بھائی خدا کے لیے یا ہوا آنے دو یا مجھے جانے دو۔ اس پر جگر صاحب نے اپنے ٹھڑا پلانے والے ساقی سے فرمایا کہ "انہیں ہوا چاہیے اور مجھے شراب" میں اٹھا اور غالب کا یہی شعر پڑھ کر چلا آیا۔

(ناطق) راز بے خودی ہے مے اہل ہوش کے لیے (کذا)

مست اس کو کیا جانیں کس گلی میں بستی ہے

(۲۷) مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے

تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

تو کیسے کیسے رعنائی اور دلربائی کے انداز مجھے دکھاتا ہے ان سے سمجھ جا کہ فراق میں تیری یاد بایں ہمہ دلجوئی مجھ پر کیا ستم ڈھاتی ہوگی۔ یا یہ کہ جب تیرے رہتے ہوئے بھی بیقراری کا یہ عالم ہے کہ تو بھی اس سے متاثر ہوتا ہے تو فراق میں میرا کیا حال ہوتا ہوگا۔ یہاں یہ مطلب نہیں نکالا جاسکتا ہے کہ تو مجھے دیکھ کر متوحش ہوتا ہے کیونکہ حال پرسی اس کے منافی ہے۔ پہلے مصرعہ کے طرزِ کلام میں اب "کیا حال ہے" بولنا درست نہ سمجھا جائے گا اس کی جگہ "کیا حال ہوتا ہے یا رہتا ہے" کہیں گے۔ اس طرزِ خطاب سے فائدہ اٹھا کر میرے ایک مرحوم ہموطن

منشی شمس الحق صاحب خیالؔ جن کی عمر کا بیشتر حصہ رام پور میں گزرا تھا مجھ سے کہنے لگے کہ غالبؔ کے اس شعر میں ذم کا بدترین پہلو نکلتا ہے میں نے کہا "ہوگا" "ہر کس بہ خیال خویش خبطے دارد" آخر غالبؔ سے نواب یوسف علی خاں مشورہ فرماتے ہی تھے اور ان کا رام پور میں جانا آنا تھا ہی۔

(۲۸) بہت سہی غمِ گیتی شراب کم کیا ہے؟
غلامِ ساقیِ کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے؟

ساقیِ کوثر پیغمبر اسلام جو حوضِ کوثر پر ساقی ہوں گے۔ مصنف اعتقاداً شیعہ نہیں تو تفضیلیہ ضرور تھے اہل تشیع کا یہ اعتقاد ہے کہ ساقیِ کوثر حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہوں گے چونکہ غالبؔ نے پیغمبر اسلام کی نسبت حضرت علیؓ کی طرف زیادہ رجحان عقیدت کا اظہار کیا ہے مثلاً ؎

مشکیں لباس کعبہ علی کے قدم سے جان
ناف زمین ہے نہ کہ نافِ غزال ہے

اس لیے میرا خیال ہے کہ یہاں ساقیِ کوثر سے مصنف کی مراد حضرت علیؓ ہیں پیغمبر اسلام نہیں۔ شراب غم غلط کرنے کا ذریعہ ہے۔ گیتی زمین جس سے یہاں مراد ہے عالم۔ کہتے ہیں غمِ دنیا اگر بہت ہے تو اسے مٹانے کے لیے شراب کی بھی تو افراط ہے کیونکہ میں ساقیِ کوثر کا غلام یعنی ان کے بادۂ شوق میں سرمست ہوں مجھے کس بات کا غم ہو سکتا ہے۔

(۲۹) ہوئی اس دور میں منسوب مجھ سے بادہ آشامی
پھر آیا وہ زمانہ جو جہاں میں جامِ جم نکلے

جمشید کی بادہ آشامی اس کے عالی مرتبت بادشاہ ہونے کی وجہ سے

جامِ جہاں نما کی ایجاد کا باعث ہوئی جو جمشید کے بعد نابود ہو گیا کیونکہ کسی میں اس کی قابلیت نہ تھی اب چونکہ مجھ سا عالی ظرف بادہ نوش پیدا ہوا ہے اس لیے پھر وہ زمانہ آگیا کہ جامِ جہاں نما کا استعمال ہو بعض لوگ غالبؔ کا نسب بھی جمشید سے وابستہ بتاتے ہیں اور ثبوت میں ان کا یہ شعر پیش کرتے ہیں۔

در من ہوسِ بادہ طبیعت کہ غالبؔ
پیمانہ بہ جمشید رساند نسبم را

غالبؔ مغل تھے اور بمبئی میں مسلم ایرانیوں کو مغل کہتے ہیں۔

(۳۰) تکلف برطرف ہے جاں ستاں تر لطفِ بدخویاں
نگاہِ بے حجابِ ناز تیغِ تیزِ عریاں ہے

صاف بات ہے کہ معشوقانِ بدخو کی نمائشی مہربانی اور بھی زیادہ جان لیوا ہے کہ ان کی نگاہِ ناز بہ عالمِ بے حجابی ننگی اور تیز تلوار کا کام کرتی ہے۔

(غالبؔ) کرنے گیے تھے اُن سے تغافل کا ہم گلِا
کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گیے

(امیر مینائیؔ) شرم کو آپ کی اللہ سلامت رکھے
شوخیوں نے تو مجھے مار ہی ڈالا ہوتا

حضرت امیر کا شعر نہایت بے تکلفانہ اور خوب ہے لیکن "اللہ سلامت رکھے" شرفا کی زبان نہیں وہ ایسے موقع پر "خدا عمر دراز کرے" کہتے ہیں۔

(آتشؔ) اسی کے سایہ میں ہوتی ہے میرے دل کی بسر
خدا دراز کرے عمر زلفِ پیچاں کی [۱]

---

[۱] لیکن آتشؔ نے یہ بھی تو کہا ہے ؎ ساقیا جام کو "اللہ سلامت رکھے"
یہ قدح میرا ہے خیر اس کی مناتا ہوں میں (دوسرے صفحہ پر حاشیے میں)

اکثر الفاظ کا محل استعمال ایسا ہوتا ہے کہ اس میں عام و خاص کے محاورے کے مطابق فرق لازم ہے حضرت استاد کے مندرجہ ذیل شعر میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔

(داغ) سخن شاہ و گدا خیر سے خالی نہ سُنا
یہ دعا کرتے ہیں سب کو وہ دعا کہتے ہیں

مطلب یہ کہ لفظ "دعا" اگر شاہی استعمال میں آئے تو کہیں گے کہ "جہاں پناہ دعا کہتے ہیں" اور اگر فقیروں کی زبان میں آئے گا تو بولیں گے کہ "جان و مال کو دعا کرتے ہیں۔

(۳۱) مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے

آبِ آتشیں کو چراغ سے تعبیر کیا۔ کہتے ہیں بہت دنوں سے ہماری بزم کو جوشِ قدح سے چراغاں ہونے کی نوبت نہیں آئی اور ہوتی بھی کہاں سے یار ہی مہمان نہیں ہوا جس کے ساتھ لطفِ مے نوشی ہے اور جس کی تابِ رخ سے نورِ ساغر ہوتا ہے۔ میری ایک غزل اس زمین میں موجود ہے جو ایک دوست کی فرمائش پر مصنف کے قوافیہ میں لکھی گئی تھی جس کے بعض اشعار جو یاد آئے نقل کیے جاتے ہیں۔

(گذشتہ صفحے کے حاشیے سے)

غالباً جناب ناطق مرحوم کی یہ رائے ہے کہ شاعر کو "شرم کو آپ کی اللہ سلامت رکھے" کے بجائے کچھ ایسا مصرع فکر کرنا چاہیئے تھا "آپ کی شرم کی اللہ کرے عمر دراز"۔ لیکن آتش کے مصرع میں 'زلفِ پیچاں' سے 'دراز' کا لفظ مناسبت رکھتا ہے مگر 'شرم' سے 'دراز' کو کوئی مناسبت نہیں ہے۔

(ناطق) بیٹھا ہوں برقِ طور کو مہماں کیے ہوئے
ذروں کو دستِ غم کے چراغاں کیے ہوئے

(۳۲) پھر وضعِ احتیاط سے رکنے لگا ہے دم
برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کیے ہوئے

دم رکنا سانس گھٹنا گھبرانا الجھن ہونا پریشان ہونا۔ کہتے ہیں چاک گریباں کی بہار دیکھتے ہوئے مدت ہو گئی اس لیے وضع احتیاط سے جو اس سے تعلق رکھتی ہے پھر دم رکنے لگا ہے اب مجھے مجبور ہو کر گریباں دری کرنی پڑی۔

(ناطق) دیوانہ وار چرخ ہے گرداں بہ کوے ناز
نورِ سحر سے چاک گریباں کیے ہوئے

(۳۳) پھر گرم نالہ ہائے شرر بار ہے نفس
مدت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کیے ہوئے

دل چاہتا ہے کہ نالۂ شرربار کی جو سیر دیکھ چکے ہیں جس سے ہر طرف آگ لگ گئی تھی اسے پھر دیکھیں اس لیے نفس پھر سرگرمِ نالہ ہاے شرربار ہے۔

(ناطق) ہے تابِ حسن باعثِ سوزِ دل و جگر
یہ گھر ہیں آپ ہی کے چراغاں کیے ہوے

(۳۴) پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق
سامانِ صد ہزار نمکداں کیے ہوے

حضرتِ عشق پھر پورے سامان کے ساتھ زخمِ دل کی مزاج پرسی کو تشریف لا رہے ہیں۔ سامانِ صد ہزار نمکداں یعنی ذوقِ حسنِ ملیح۔

(ناطق) مہمانِ غم ہوں ذوق ہے حسنِ ملیح کا
بیٹھا ہوں زخمِ دل کو نمکداں کیے ہوے

(۳۵) پھر پھر رہا ہوں خامۂ مژگاں بہ خونِ دل
ساز چمن طرازیِ داماں کیے ہوئے

پھر دامن پر گل بوٹے بنانے کا ارادہ ہے اس لیے اپنے خامۂ مژگاں کو خونِ دل کی سیاہی سے بھر رہا ہوں اب دیکھنا اس کی تراوش سے کیسی کیسی گلکاریاں ہوتی ہیں۔

(ناطق) کس شان سے چلی ہے براتِ جنونِ عشق
دامن کو جیب جیب کو داماں کیے ہوئے

(۳۶) باہم دِگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب
نظّارہ و خیال کا ساماں کیے ہوئے

دل کو اُسے آغوشِ تصوّر میں لینے کا خیال ہے اور آنکھ کو آغوشِ نظارہ میں لینے کا۔ اس سامان سے دونوں میں پھر رقابت کی صورت پیدا ہو گئی اس خیال کو مصنّف نے بار بار باندھا ہے چنانچہ ایک شعر یہ ہے۔

(غالبؔ) نے مژدۂ وصال نہ نظّارۂ جمال
مدّت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے

(ناطق) ہے ہر نفس یہاں دمِ شمشیر کا جواب
جیتے بھی ہیں تو موت کا ساماں کیے ہوئے

(۳۷) پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب
عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کیے ہوئے

پھر سودائے عشق سوار ہوا ہے اور بازارِ محبت میں اس سامان کی دوکان لگا کر بیٹھے ہیں جسے عقل دل اور جان کہتے ہیں کہ کوئی اہلِ ناز و غمزہ ان کی قیمت لگانے کے لیے خریدار مل جائے تو دام کھرے کر لیں۔

(ناطق) اللہ رے ذوقِ لذتِ غم جس کے فیض سے
رکھتے ہیں جان ودل کو دل وجاں کیے ہوے

(۳۸) اک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوے

نگاہ ایک نوبہارِ ناز کی تاک میں ہے کہ پھر کسی طرح بہارِ نظارہ کی رُت آئے اور وہ سرورِ مے سے باغ باغ دکھائی دے۔

(ناطق) محوِ نظارہ دیدۂ نرگس سے ہے بہار
ہر گل کو نوبہارِ گلستاں کیے ہوے

(۳۹) پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیر بارِ منّتِ درباں کیے ہوے

پھر جی چاہتا ہے کہ معشوق کے دروازہ پڑے رہیں اور اس کے ایسا شوق دامنگیر ہے کہ درباں کا احسان اٹھانا جو پہلے عار تھا، وہ بھی منظور ہے۔

(ناطق) ہے تم کو گھر پہ ناز مصیبت کی بات ہے
جا دادِ بدمزاجیِ درباں کیے ہوے
جی ڈھونڈتا ہے پھر دہی فرصت کے[1] رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوے

---

[1] اس شعر کا پہلا مصرع یوں ہے ۔ جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن ، یعنی دل پھر وہی پہلی سی فرصت ڈھونڈتا ہے تاکہ پہلے کی طرح رات دن تصورِ جاناں کیے ہوئے بیٹھے رہیں ۔ اردو کے اچھے اچھے دانشوروں کو بھی اس شعر کو غلط لکھتے پڑھتے اور بولتے دیکھا گیا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ پہلے مصرع کا 'کہ رات دن' دوسرے مصرع کا حصہ ہے۔

دل پہلے کی فرصت کو ڈھونڈتا ہے کہ جب تصوّرِ جاناں میں بیٹھنے کا لطف تھا۔ یا یہ کہ ان فرصت کے شب و روز کو جو میسّر نہیں دل پھر ڈھونڈتا ہے جب تصوّرِ یار میں بیٹھے رہتے تھے۔ بڑا اچھا شعر ہے بہت مشہور ہے اور ایک مبتذل قافیہ کو بڑے کمال سے نظم کیا ہے۔

(ناطق) تصدیق ہے یہ خلوتِ آئینہ خامشی
تصویر ہے تصوّرِ جاناں کیے ہوئے

(۴۰) وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے

اے حضرت خضر ایک، ہماری چند روزہ زندگی ہے کہ ہم لوگوں سے روشناس ہوتے ہوئے ہنس بول کر اس کا لطف اٹھاتے ہیں اور ایک تمہاری حیاتِ جاوید کہ تمہیں کسی سے ملنے کی بھی چوری ہو گئی۔

(ناطق) پھرے جاؤ خضر تم منہ چھپائے رہتی دنیا تک
جیو اور لطفِ عمرِ جاودانی دیکھتے جاؤ

لفظ خضر بکسرِ خا و سکونِ ض بھی درست ہے اور بہ فتحِ ض بھی یہ اردو کا استعمال ہے لیکن عربی میں اس کا صحیح لفظ بہ فتحِ خا و کسرِ ض ہے۔

۱۔ غالب کے اس مشہور شعر کے ہوتے ہوئے جنابِ ناطق کا شعر بھی لطف سے خالی نہیں۔

پنج آہنگ کے چند اہم نسخے

میرے غالب کلکشن میں غالب کی مشہور نثری تالیف 'پنج آہنگ' کے بہت سے نسخے ہیں۔ یہاں صرف انہیں نسخوں کی فہرست دی جاتی ہے، جو لگ بھگ ایک صدی پہلے ۱۸۳۹ء سے ۱۸۸۸ء تک یعنی تقریباً ۵۰ سال کے عرصے میں لکھے گئے یا شائع ہوئے۔

۱۔ پنج آہنگ (قلمی)۔ آخری چند صفحے غائب ہیں اس لیے ترقیمہ موجود نہیں۔ کتابت شدہ تقریباً مئی ۱۹۳۹ء تا مئی ۱۸۴۰ء

۲۔ ایضاً (قلمی)۔ کتابت شدہ ۲۳ مئی ۱۸۴۰ء

۳۔ ایضاً ۔ مطبوعہ ۴ اگست ۱۸۴۹ء

۴۔ ایضاً ۔ مطبوعہ اپریل ۱۸۵۳ء

۵۔ کلیاتِ نثرِ غالب (اس میں "پنج آہنگ" شامل ہے) مطبوعہ نول کشور لکھنؤ (طبع اوّل)

۶۔ ایضاً ________ مطبوعہ نولکشور (طبع دوم) جنوری ۱۸۷۱ء

۷۔ ایضاً ________ مطبوعہ نولکشور ________ ۱۸۷۵ء

۸۔ ایضاً ________ ایضاً ________ ۱۸۸۴ء

۹۔ ایضاً ________ ایضاً ________ ۱۸۸۸ء

مندرجہ بالا فہرست کے پہلے ۵ نسخے اہم ترین ہیں کیوں کہ یہ سب غالب کی زندگی میں

کتابت ہوئے یا طبع ہوئے اور چھٹا نسخہ (مطبوعہ ۱۸۷۱ء) اگرچہ غالبؔ کی وفات کے بعد شائع ہوا تو بھی اہم ہے کیوں کہ اس میں دو خط اضافہ کیے گئے تھے۔ بقیہ تینوں نسخے (۷، ۸، ۹) اسی کی نقل ہیں اس لیے چنداں اہمیت کے حامل نہیں۔

پنج آہنگ کی بنیاد کا ایک قصّہ ہے۔ بھرت پور کے قضیے میں جب انگریزوں اور درجن سال کی ٹھن گئی تو اس جنگ میں حصّہ لینے کے لیے نومبر، دسمبر ۱۸۲۵ء میں نواب احمد بخش خاں انگریزوں کی طرف سے گئے تھے ان کے ہمراہ غالبؔ اور مرزا علی بخش خاں (غالبؔ کے برادرِ نسبتی) بھی تھے۔ یہ قضیہ ۱۸ جنوری ۱۸۲۶ء کو ختم ہوا اور درجن سال کو ریاست سے نکال دیا گیا (ذکرِ غالبؔ۔ پانچواں ایڈیشن ص ۵۷-۵۸) وہیں ۱۸ جنوری ۱۸۲۶ء سے کچھ پہلے یا بعد اپنی رہنمائی کے لیے مرزا علی بخش خاں نے غالبؔ سے ایسے تمام کلمات جمع کر دینے کے لیے کہا جو خطوں میں القاب آداب اور شکر و شکوہ و شادی و غم کے اظہار کے لئے استعمال کیے جاتے ہیں۔ اس پر مرزا نے تین روز میں آہنگ اوّل (قلمی۔ آہنگ سوّم) ترتیب دیا اور کچھ عرصے بعد آہنگ دوّم (قلمی۔ آہنگ پنجم) "مصادر و مصطلحات و لغاتِ فارسی" لکھا۔ یہ آہنگ اگرچہ ۱۸۲۶ء ہی میں لکھا گیا تھا مگر اُس وقت غالبؔ بھرت پور میں نہیں تھے۔ جیسا کہ مقدّمہ پنشن کے عرضی دعوے (فسانۂ غالبؔ ص ۱۱۱) سے ثابت ہوتا ہے نواب احمد بخش خاں جنوری ۱۸۲۶ء کے بعد چندے بیمار رہ کر بھرت پور سے فیروز پور آگئے تھے اور غالبؔ انہیں کے ساتھ رہے۔ فیروز پور کا علاقہ ریگستانی ہے۔ جس کا ذکر غالبؔ آہنگ دوّم کی تمہید میں کرتے ہیں اور وہیں ان کا یہ کہنا کہ مرزا علی بخش خاں ہی کی خواہش پر آہنگ دوّم (آمیزۂ پارسی زبان و ہنجارِ ایں گفتارِ سخن) لکھنے پر میں تیّار ہوا تھا، اس بات کا مزید ثبوت ہے کہ ابھی وہی سفر جاری ہے جو نواب احمد بخش خاں اور مرزا علی بخش خاں کے ساتھ، غالبؔ نے دلّی سے نومبر۔ دسمبر ۱۸۲۵ء میں شروع کیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سفر کئی ماہ تک جاری رہا۔ اس طرح پنج آہنگ کی نیو ۱۸۲۶ء ہی میں پڑی اگرچہ اُس وقت پانچ آہنگوں کا کوئی خاکہ ذہن میں نہیں تھا۔ نہ ہی مرزا غالبؔ کے نہ مرزا علی بخش خاں

کے۔ بقیہ تین آہنگ ۱۸۳۵ء میں ترتیب دیے گئے (اگرچہ اضافے مسلسل ہوتے رہے)، اور وہیں اس مجموعۂ نثر کا نام پنج آہنگ رکھا گیا جیسا کہ مرزا علی بخش خاں کے دیباچے سے ظاہر ہے۔ دیباچۂ پنج آہنگ مرزا علی بخش خاں (مرزا غالب کے برادرِ نسبتی اور الٰہی بخش خاں معروف کے صاحبزادے) نے لکھا تھا۔ مرزا علی بخش خاں (جو نواب شمس الدین احمد خاں کے چچازاد بھائی تھے اور ان کے کاروبارِ ریاست سے مطمئن نہ تھے) کچھ دیر کے لیے لکھنؤ اور پھر جے پور چلے گئے تھے۔ شمس الدین احمد خاں کی وفات کے بعد یہ واپس دلی آ گئے اور قیاس ہے کہ اکتوبر کے آخر تک دہلی پہنچ گئے ہونگے۔ وہ دلی میں اپنے بہنوئی غالب کے یہاں ٹھہرے۔ مرزا علی بخش خاں نے دیباچے میں لکھا ہے کہ شمس الدین احمد خاں کا واقعہ (قتلِ فریزر اور پھانسی) ۱۲۵۱ھ کے آغاز میں ہوا تھا۔ ۱۲۵۱ھ، ۳۰ اپریل ۱۸۳۵ء تا ۱۸ اپریل ۱۸۳۶ء کے مطابق ہے۔ ولیم فریزر کا قتل ۲۲ مارچ ۱۸۳۵ء (۲۱ شوال ۱۲۵۰ھ) کو ہوا تھا اور شمس الدین احمد خاں کو پھانسی ۸ اکتوبر ۱۸۳۵ء (۱۴ جمادی الثانی ۱۲۵۱ھ) کو دی گئی تھی۔ غالب اپنے ایک خط بنام شیفتہ (جو پنج آہنگ میں شامل ہے)، میں لکھتے ہیں کہ مرزا علی بخش خاں جے پور سے بیمار ہو کر آئے ہیں اور میرے پاس ہی رہ رہے ہیں یہ خط کا اصل جملہ ملاحظہ فرمائیے کیونکہ اس نے ایک عجیب غلط فہمی پیدا کر دی ہے۔ جس کی لپیٹ میں غلام رسول مہر اور وزیر الحسن عابدی جیسے ماہرینِ غالبیات بھی آ گئے ہیں۔ غالب کہتے ہیں۔

"برادر بجاں برابر مرزا علی بخش خاں، بہادر رنجور از جے پور آمدہ و بہ کاشانۂ نامہ نگار طرح اقامت کردہ ...."

یہاں غالب نے رنجور بمعنی علیل استعمال کیا تھا (آگے چل کر وہ بیمار داری کا ذکر بھی کرتے ہیں) مگر یار لوگوں نے اسے علی بخش خاں کے ساتھ بطورِ تخلص جوڑ دیا۔ اس کی ایک وجہ اور بھی سمجھ میں آتی ہے۔ غالب کے علاوہ، علی بخش خاں کے ایک دوسرے بہنوئی (بڑی بہن بنیادی بیگم کے شوہر) بھی تھے۔ ان کا نام نواب غلام حسین خاں اور تخلص مسرور تھا۔ چونکہ رنجور، مسرور کا ہم قافیہ ہے اس لیے عموماً یقین کر لیا گیا ہوگا کہ بہنوئی کا تخلص مسرور ہے اور سالے

کارنجور، حالانکہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے کیونکہ مرزا علی بخش خاں کا سرے سے شعر کہنا ہی ثابت نہیں۔

خیر، انہیں ایام میں غالب کے فارسی کلام کا مجموعہ میخانۂ آرزو سرانجام کے نام سے مرتب ہوا تھا۔ اس میں مرزا علی بخش خاں نے غالب کی نثر پڑھی تو خیال آیا کہ کیوں نہ ان کے دیوان کی تمام نثری تحریروں کو یکجا کر دیا جائے، لیکن "ہجوم افکار و وفورِ آلام" نے فرصت نہ دی حتیٰ کہ حکیم ضیٰ الدین حسن خاں نے تحریک کی۔ علی بخش خاں کے ایک ہم سبق میر محمد حسین خاں بھی ان کے ساتھ ہو گئے۔ یہ بھی خیال کیا کہ ان کا لڑکا غلام فخر الدین خاں اس سے استفادہ کرے گا۔ چنانچہ اس ارادے نے صورت اختیار کر لی اور یہ کلام جو پنج آہنگ پر مشتمل ہے آراستہ ہوا۔ ظاہر ہے دیوان کی نثری تحریروں کے ساتھ، ۱۸۲۶ء کے اوراق اور دیگر متفرق نثری نگارشات کو بھی یکجا کر دیا گیا۔ یہ سب کلام فارسی نثر تک محدود تھا۔

یہاں کچھ غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لئے آہنگ سوم (قلمی) آہنگ چہارم) کا کچھ تفصیل سے ذکر کر دینا ضروری ہے۔ اس آہنگ کا عنوان ہے "اشعار مکتوبی منتخب از دیوان رشکِ گلستاں کہ در مکاتبات بکار آید"۔ یہ عنوان مرزا علی بخش خاں نے اپنے دیباچے میں قائم کیا تھا جو آج تک جوں کا توں قائم ہے۔ متن میں آہنگ کا عنوان یہ ہے "آہنگ سوم مشتمل اشعارِ مکتوبی منتخب از دیوان کہ در مکاتبات بکار آید و اقسامِ نثر را آرایش دہد"۔ قلمی نسخوں اور مطبوعہ نسخوں میں صرف یہ فرق ہے کہ آہنگ سوم کی جگہ آہنگ چہارم ہے اور مکتوبی کی جگہ مکتوب ہے۔ دیباچے اور متن کے عنوانات میں ہر نسخے میں یہ فرق رکھ دیا گیا ہے کہ رشکِ گلستاں کے الفاظ نکال دیے گئے ہیں اور "و اقسامِ نثر را آرایش دہد" کا ٹکڑا بڑھا دیا گیا ہے باقی پورا کا پورا آہنگ وہی ہے جو پہلے پہل تالیف کیا گیا تھا۔

آہنگ سوم کے کل اشعار کی تعداد ۱۳۴ ہے، جس میں ۳ رباعیاں (۱۰ شعر) بھی شامل ہیں اور یہ سب شعر اسی دیوان سے لیے گئے ہیں جو ۱۸۳۵ء میں میخانہ آرزو سرانجام' کے نام سے مرتب ہوا تھا اور بعد میں ۱۸۴۵ء میں اشاعت پذیر ہوا۔

میں نے بیشتر اشعار مقابلہ کر کے دیکھے ہیں اور یہ اس بات کا بیّن ثبوت ہیں کہ یہ آہنگ ۱۸۳۵ء ہی میں لکھا گیا تھا اس سے پہلے نہیں۔ اشعار میں بعض مقامات پر لفظی ترمیمیں ہیں، جو دلچسپی سے خالی نہیں۔

پنج آہنگ قلمی (۱۸۳۹ء)	کلیات طبع اوّل (۱۸۴۵ء)	پنج آہنگ طبع اوّل (۱۸۴۹ء)
پریشاں تر ز خویشم داستانیست	پریشاں تر ز زلفم ----	پریشاں تر ز خویشم ----
غبارش جوہرِ جانست گوئی	غبارش جوہر ----	غبارش گوہر ----
کجاست دست کہ چینیم ثمر ز نخلِ مراد	---- نخلِ امید	---- نخلِ مراد
گیرم وفا ندارد اثر ----	---- گوئی وفا	---- گیرم وفا
فرقیست نہ اندک ----	---- فرقیست	---- فرق است
ہر پارۂ دل کہ ریزم از دیدۂ فرد	---- از دیدہ من	---- از دیدۂ فرد

تمام (۱۳۴) اشعار نعتوں، مثنوی چراغِ دیر، مثنوی رنگ و بو، مثنوی بادِ مخالف، غزلوں اور رباعیوں (۳) سے لیے گئے ہیں اور غالب کے کلامِ فارسی طبعِ اوّل (۱۸۴۵ء) میں چھپ چکے ہیں۔

آہنگوں کی ترتیب جو قلمی نسخوں میں ملتی ہے یہ ہے۔

۱۔ آہنگ اوّل ۔ نثرہائے داخل دیوان کرامت نشاں

۲۔ آہنگ دویم ۔ نثرہائے خارج دیوان

۳۔ آہنگ سویم ۔ القاب و آداب و مراتب متعلقہ آں

۴۔ آہنگ چہارم ۔ اشعار مکتوبی منتخب از دیوان رشکِ گلستاں کہ در مکاتیبات بکار آید

۵۔ آہنگ پنجم ۔ مصادر و مصطلحات و لغات فارسی

مگر جب پنج آہنگ پہلی بار ۱۸۴۹ء میں شائع ہوئی تو آہنگوں کی ترتیب میں نمایاں فرق

کر دیا گیا۔ جس کی تفصیل یہ ہے :

۱۔ آہنگ اول ۔ القاب و آداب و مراتب متعلقہ آں (آہنگ سویم۔قلمی)
۲۔ آہنگ دویم ۔ مصادر و مصطلحات و لغات فارسی (آہنگ پنجم۔قلمی)
۳۔ آہنگ سویم ۔ اشعار مکتوبی منتخب از دیوان رشک گلستاں
که در مکاتبات بکار آید (آہنگ چہارم۔قلمی)
۴۔ آہنگ چہارم ۔ خطب و کتب و تقاریظ و عبارات متفرقہ
۵۔ آہنگ پنجم ۔ مکاتبات

متنِ مطبوعہ میں مرزا علی بخش خاں: پنج آہنگ کے اصل مولف غالب کے برادرِ نسبتی مرزا علی بخش خاں تھے۔ جب تک پنج آہنگ مسودے کی شکل میں رہی وہی اس کے مولف ٹھہرے رہے مگر جب مسودے کو طباعت کے لیے تیار کیا گیا تو اس میں اوپر دی ہوئی آہنگوں کی ترتیب میں ردو بدل کے علاوہ ایک بنیادی تبدیلی اور عمل میں آئی۔ اب مرزا علی بخش خاں کی جگہ کم و بیش غالب خود مولف کے مقام پر جلوہ گر ہو گئے تاہم دیباچہ مرزا علی بخش خاں ہی کا رہا اور ذیل کی ایسی معمولی حک و ترمیم کے علاوہ آج تک جوں کا توں موجود ہے۔ ترمیم یہ ہے۔

۱. قلمی۔ ۔ ۔ ۔ چوں فخر الدولہ بہادر کہ خدایش بفردوسِ بریں جا دہاد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

مطبوعہ۔ ۔ ۔ ۔ چوں فخر الدولہ کہ خدایش در بہشتِ بریں جا دہاد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۲. قلمی۔ ۔ ۔ ۔ والا دودمان رضی الدین حسن خاں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

مطبوعہ ۔ ۔ ۔ ۔ والا دودمان حکیم رضی الدین حسن خاں بہادر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

پنج آہنگ قلمی کے آہنگ اول کے آخر میں، جہاں یہ سات نثری تحریریں (۱) دیباچہ دیوانِ فارسی (۲) دیباچہ گلِ رعنا، (۳) دیباچہ دیوانِ ریختہ (۴) نامہ بنام نامی نواب سید علی اکبر خاں متوالی امام باڑہ ہوگلی بندر (۵) خاتمہ گلِ رعنا (۶) خاتمہ عبارت و باعث ترتیب دیوانِ فارسی (۷) خاتمہ دیوانِ فارسی) ختم ہوتی ہیں۔ ایک تحریر مرزا علی بخش خاں جامع پنج آہنگ کی طرف سے

ہے جس کا ضروری اقتباس یہ ہے :

"للہ الحمد کہ جامع این اوراق یعنی علی بخش ۔۔۔۔۔۔ ہمگی نثر از دیوان ۔۔۔
۔۔۔۔۔ حضرت غالب، درایں اجزا نقل کردہ آہنگ اوّل را سر انجام دادو
آمادۂ گزارشِ دو میں آہنگ شد۔۔۔۔۔۔۔ نثر ہاے خارج از دیوان
بسیار است۔۔۔۔۔۔۔۔ باجواب اجازت ایں معنی دادہ می آید کہ از ہرچہ
از عباراتِ غالبی در زمانہاے مختلف بنظر گزرد، آں را دریں آہنگ جا
دہند و بر جامع (علی بخش خاں) ایں پنج آہنگ منت نہند ــــــ"

مطبوعہ کتاب میں یہ پوری عبارت حذف کر دی گئی ہے۔ پنج آہنگ میں علی بخش کے نام کے چار خط ان عنوانات کے ساتھ شامل تھے۔ (۱) نامہ کہ از دہلی بنام ایں مستہام رقم فرمودہ ، (۲) رقعہ بنام جامع کتاب (۳) خط بنام کمترین کہ از کلکتہ فرستادہ اند (۴) ایضاً[1] ــــــ مستہام ، جامع کتاب، کمترین سے صاف ظاہر ہے کہ یہ خطوط مولفِ کتاب علی بخش خاں کے نام ہیں۔ مگر طبع اوّل (۱۸۴۹ء) میں یہ سب عنوانات اس طرح بدل دیے گئے (۱) نامہ کہ از دہلی بنام مرزا علی بخش خاں بہادر رقم شد (۲) ایضاً (۳) ایضاً از کلکتہ (۴) ایضاً از کلکتہ۔

اس طرح مرزا علی بخش خاں کی حیثیت بطور جامع یا مولفِ کتاب ختم ہو گئی۔

قلمی اور مطبوعہ متن کا فرق : قلمی اور مطبوعہ نسخوں کے متن میں فرق ناگزیر تھا کیوں کہ جیسا کہ مرزا علی بخش خاں کی حذف شدہ تحریر سے ثابت ہے ابھی غالب کی متفرق تحریریں جمع ہو رہی تھیں، خاص کر خطوط مگران کے علاوہ بھی متن میں بہت سی ترامیم کی گئی ہیں مثلاً قلمی نسخے کا آہنگ پنجم (مطبوعہ نسخے کا آہنگ دوم) 'پانچ زمزموں' پر مشتمل ہے۔ مگر مطبوعہ نسخوں میں صرف 'چار زمزمے' ہیں۔ پورے متن کا مقابلہ بہت دقتِ نظری کا کام ہے اور الگ سے ایک مقالے کو محیط ہو سکتا ہے اس لیے یہاں نظر انداز کیا جاتا ہے۔ مکتوبات کے لیے احتیاط

---

[1] مخطوطہ ۱۸۴۸ء میں اس کا عنوان یہ ہے " خط کہ نیز از کلکتہ لبعقیدت کیش نگاشتہ ہند "

خاص طور پر ضروری ہے کیونکہ غیر مطبوعہ اور مطبوعہ متون کا فرق غالب کے اس عہد کے سوانح پر بہت کچھ اثر انداز ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے ایسے خطوں کو پورا کا پورا رد کر دینا پڑے جن میں ترمیم سے نفسِ مضمون ہی بدل گیا ہوگا کیوں کہ خطوں کا مضمون بعد میں نہیں بدلا جا سکتا۔

اب اوپر دیے ہوئے اہم نسخوں کی تفصیل ملاحظہ فرمائیے۔

(۱) **پنج آہنگ۔ قلمی نسخہ نمبر ۱:** یہ قدیم نسخہ ناقص الوسط اور ناقص الآخر ہے، تاہم کتاب کا نوّے فی صد حصّہ باقی ہے اور جو صفحات نہیں ہیں ان سے کچھ ایسا نقصان نہیں ہوا سوائے ترقیمے کے ضائع ہونے کے، جس کی وجہ سے مخطوطے کی تاریخِ کتابت متعین کرنے میں دشواری آ رہی ہے۔ صفحات ۱۹۱ ہیں (نمبر میں نے لگائے ہیں) یہ ۱۵ سطری (کہیں کہیں ۱۶ سطریں بھی ہیں) مخطوطہ کسی دوسرے مخطوطے کی نقل ہے جسے غالب سمیت ۸ نقل نویسوں نے پورا کیا ہے۔ مرزا علی بخش خاں کا دیباچہ ص ۴ پر ختم ہوتا ہے اور وہیں سے آہنگ اول "نثرہاے داخل دیوان کرامت نشان" شروع ہوتا ہے ص ۲۴ پر علی بخش خاں کی وہ عبارت (للہ الحمد کہ جامع ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ منت نہند" ہے۔ جو مطبوعہ نسخوں میں شامل نہیں کی گئی۔ ص ۳۴ سے آہنگ دویم "نثرہاے خارج دیوان" شروع ہوتا ہے ص ۹۱ پر شیخ امیر اللہ سرور کے خط کے خاتمے پر نقل نویس سے ایک اردو شعر چھوٹ گیا تھا جسے حاشیے میں ایسے خط میں اضافہ کیا گیا ہے جو غالب کے خط سے ملتا جلتا ہے مگر وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ بخطِ غالب ہے ؎

نہ خریدار کا حصّہ ہوں نہ حق بائع کا
میں وہ دانہ ہوں کہ گر جائے کفِ میزاں سے۔ والسلام

ص ۹۴ پر نواب مصطفےٰ خاں (شیفتہ) کے خط میں غالب لکھتے ہیں "امروز کہ ۔ ۔ ۔ اندوہِ درونی، بہ پارسی ناآمیختہ بہ تازی رنگاشتہ آمد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ " آج جبکہ اندوہِ درونی کو خالص فارسی (جس میں کوئی لفظ عربی کا نہیں) میں لکھا ہے [اُردی بہشت کا بہمن روز ہے اور عیسوی ۲۲ اپریل ہے] یہ خط ۳۶/۱۸۳۵ء کے آس پاس

لکھا گیا ہے اگر یزدگردی سنہ کے مطابق ۱۸۳۵ء کے اِدھر اُدھر کسی سال میں ۷؍ اُردی بہشت اور ۲۲ اپریل ایک ہی دن پڑتے ہوں تو خط کی صحیح تاریخ معلوم ہو جائے گی۔ یہاں صرف یہ کہنا ہے کہ غالب کو خالص فارسی میں لکھنے کا ہوکا شاید جوانی ہی سے تھا جس کا مظاہرہ پوری قوت سے دستنبو (۵۸/۱۸۵۷ء) میں ہوا مگر باوجود زبردست احتیاط کے بعض عربی کے الفاظ اس میں آ گئے۔ یہی حال بیس بائیس سال پہلے سے اس خالص فارسی خط کا ہے۔ اس میں بھی بعض الفاظ ایسے آ گئے جو خالص فارسی نہیں ہیں مثلاً "ایں ہوائے شگفت" میں ہوا اور "ماتم زدگان" میں ماتم۔ "ماتم زدہ" اگرچہ فارسی میں رائج ہے مگر ماتم کی اصل عربی ہے۔

ص ۹۸ "آرایشِ گفتار در ظہور ہور و نمودارئ صبح" کے آخری چند شعر (پانچ سطریں) غالب کے قلم سے ہیں۔ ان سطور سے پہلے اور بعد کا قلم ایک ہی ہے صرف درمیان کی پانچ سطروں غالب کے خط میں ہیں۔ ص ۱۵۵ پر آہنگ دویم ختم ہو جاتا ہے اس میں صرف ۶۹ خط ہیں۔ "والسلام" لکھنے کے بعد یہ آہنگ ختم ہو جاتا ہے اور پھر صفحے کا ایک تہائی حصہ خالی چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس کے آگے کتابت شدہ اوراق ضائع ہونے کا کوئی احتمال نہیں۔ ص ۱۵۶ سے آہنگ سوم (مطبوعہ آہنگ اول) شروع ہوتا ہے۔ ص ۱۵۷ سے تقریباً ۱۲ اوراق غائب ہیں۔ ص ۱۷۵ سے آہنگ چہارم (مطبوعہ آہنگ سوم) ہے جس میں ۱۳۴ شعر ہیں اور سب کے سب غالب کے فارسی کلام طبع اول میں موجود ہیں۔ ظاہر ہے یہ اولین تدوینِ

۱۔ بقول عندلیب شادانی (صحیفہ غالب نمبر جنوری ۱۹۶۹ء ص ۱۷۰) "غالب نے عربی الفاظ کے بجائے فارسی الفاظ کا استعمال ابوالفضل (آئینِ اکبری) کے تتبع میں کیا اور یہ 'پنج آہنگ' کے ہر صفحے سے نمایاں ہے۔"

دیوان یا کلیات نے میخانۂ آرزو سرانجام (۱۸۳۵ء) ہی سے اخذ کئے گئے ہیں۔ ص ۱۸۲ پر یہ آہنگ ختم ہوتا ہے اور وہیں سے آہنگ پنجم (مطبوعہ آہنگ دوم) کا آغاز ہوتا ہے۔ شروع کی عبارت یہ ہے "ازیں آہنگ پنج زمزمہ می خیزد، نخستین زمزمہ بدیباچگی ایں آہنگ روشناس ۔۔۔۔۔" مطبوعہ نسخوں میں پنج زمزمہ' کو 'چار زمزمہ' سے اور "نخستین زمزمہ بدیباچگی ایں آہنگ روشناس" کو "نخستین زمزمہ بنکاتے کہ حقیقت مصادر ازاں بے پردہ گردد" سے بدل دیا گیا ہے۔ گویا ایک زمزمہ کم کر دیا گیا ہے۔ آخر کے ۱۲ صفحے غائب ہیں جن میں ترقیمہ بھی ضائع ہو گیا ہے۔ اس طرح مخطوطہ ۱۹۱ صفحہ پر ختم ہو جاتا ہے۔

یہ قلمی نسخہ جسے میں نے نسخہ ۱ کا نام دیا ہے کسی ایک پیشہ ور کاتب کا لکھا ہوا نہیں ہے بلکہ مختلف اوقات میں کم از کم ۸ نقل نویسوں نے کہیں خوشخط کہیں خطِ شکست میں لکھا ہے غالباً یہ منتشر اوراق سے صاف کیا ہوا مسودہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے قلمی نسخہ ۲ (جس کا حال آگے آئے گا) اسی کو سامنے رکھ کر ایک پیشہ ور کاتب نے ۲۳ مئی ۱۸۴۰ء کو مکمل کیا تھا۔ گویا نسخہ ۱، ۲۳ مئی ۱۸۴۰ء سے پہلے کا ہے۔ نسخہ ۱ میں وہ خط بنام میر سید علی غمگین (نام عرف حضرت جی یہاں خط کا عنوان خالی چھوڑ دیا گیا ہے) موجود ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ پنشن کے مقدمے کی اپیل کے کاغذات کو اب لنڈن گئے دو سال ہوتے ہیں۔ لنڈن کو یہ کاغذ ۱۰ مئی ۱۸۳۷ء کو گئے تھے۔ اس طرح نسخہ ۱، ۱۰ مئی ۱۸۳۹ء یا اس کے بعد کا لکھا ہوا قرار دیا جا سکتا ہے۔ گویا نسخہ ۱، ۱۰ مئی ۱۸۳۹ء و ۲۳ مئی ۱۸۴۰ء تک کے عرصے میں کسی وقت بھی پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

قلمی نسخہ ۲ کو میں قلمی نسخہ ۱ کی صاف شدہ صورت ان وجوہات کی وجہ سے قرار دیتا ہوں۔

۱۔ نسخہ ۱ بہت سے ہاتھوں کا لکھا ہوا ہے جبکہ نسخہ ۲ ایک ہی خط میں اور ایک پلان کے تحت کتابت ہوا ہے۔ مواد اگرچہ وہی ہے مگر معمولی اضافے بھی ہوئے ہیں۔

۲۔ نسخہ ۱ میں بہت سی غلطیاں راہ پا گئی ہیں۔ اس میں کا ہر نقل نویس کاتی محتاط نہ تھا۔ یہ تمام غلطیاں نسخہ ۲ میں درست کر دی گئی ہیں۔

۳۔ ص ۵۲ پر مرزا علی بخش خاں کے نام کے ایک خط کا عنوان اس سے پہلے کے خط کی وجہ سے (جس کا عنوان خط بنام کمتر بن کہ از کلکتہ فرستادہ اند، تھا) 'ایضاً' لکھا تھا، اُسے نسخہ ۲ میں یہ عنوان دیا گیا ہے۔ "خط کہ نیز از کلکتہ بعقیدت کیش نگاشتہ اند"۔ ظاہر ہے کہ یہ نسخہ ۱ پر اضافہ ہے۔

۴۔ ص ۱۹ پر نسخہ ۱ میں ایک خط کا عنوان ہے "در رسید مکتوب"۔ نسخہ ۲ میں اسے "نامہ بدوستے در رسید مکتوب" میں بدل دیا گیا ہے۔ یہ بھی نسخہ ۱ پر اضافہ ہے ایسے اور بھی کئی اضافے ہیں۔

۵۔ نسخہ ۱ میں بہت سے عنوانات کی جگہ خالی چھوڑ دی گئی تھی۔ نسخہ ۲ میں یہ سب عنوانات پُر کر دیے گئے ہیں۔

(۲) پنج آہنگ۔ قلمی نسخہ ۲ : پہلے ترقیمہ ملاحظہ کیجیے :

"نسخۂ پنج آہنگ تصنیف جناب اسداللہ خاں و معروف مرزا نوشہ بموجب حکم احترام الدولہ رئیس الحکما حاذق الزماں حکیم سید احسن اللہ خاں صاحب بہادر ثابت جنگ، بخطِ خام بندہ سید غلام عباس ولد سید حسن علی ساکن کول محلہ جیب گنج[1] دبالفعل وارد شاہجہان (آباد)[2] بتاریخ بست ۲۲ سیوم ماہ مئی ۱۸۴۱ء عیسوی مطابق بستم ۲۰ ربیع الاول ۱۲۵۷ھ بروز شنبہ بوقت چہار گھڑی روز باقی ماندہ بصورتِ اختتام پذیرفت ۵ تم تم تم تم تم تم"

۱۔ یہ لفظ اس طرح لکھا ہے "جیگنج"۔ یہ "جیب گنج" بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ کیا علی گڑھ (کول) میں کوئی اس نام کا محلّہ ہے؟

۲۔ آباد لکھنے سے رہ گیا ہے۔

جناب وزیرالحسن عابدی مرحوم نے 'پنج آہنگ' (مجلس یادگارِ غالب۔ لاہور ۱۹۶۹ء) مرتب کرنے میں جن ماخذ(وں) سے کام لیا ہے ان میں ایک ماخذ وہ قلمی نسخہ ہے جس کا ترقیمہ ہو بہو وہی ہے جو میں نے اوپر دیا ہے۔ نسخہ ۳ میری ملک میں گزشتہ آٹھ دس سال سے ہے۔ اس لیے یہ قطعی ممکن ہے کہ یہ نسخہ ۳ اس سے پہلے کبھی وزیرالحسن عابدی صاحب کے پیش نظر رہا ہو مگر ان میں سے لیے ہوئے حوالے اتنے گمراہ کن ہیں کہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ عابدی صاحب نے حقیقتاً یہ مخطوطہ کبھی دیکھا نہ ہوگا، محض خطوں کی تفصیل اور ترقیمے کی نقل منگوائی ہوگی۔ یہ شک اس لیے بھی قوی ہو جاتا ہے کہ جہاں انہوں نے اپنی کتاب میں دوسرے دو خطی نسخوں کی تفصیل دی ہے وہاں اس نسخہ ۳ کی سرے سے تفصیل ہی نہیں دی، محض ترقیمہ نقل کر دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نسخہ ۳ کے مکاتبات والے آہنگ کا کچھ حصہ ضائع ہو چکا ہے اس لیے چند خطاب اس مخطوطے کا حصہ نہیں رہے۔ عابدی صاحب اس خیال میں رہے کہ شاید یہ خط اس نسخے میں کبھی شامل ہی نہ تھے لہٰذا انہوں نے ان خطوں کو ۱۸۴۰ء کے بعد کا مان لیا جو غلط ہے کیونکہ یہ تمام خط نسخہ ۱ (۱۸۳۹ء) میں شامل ہیں۔ عابدی صاحب لکھتے ہیں "آرایش گفتار در ظہور بود و نمود داری جبیح"۔ ۱۸۴۰ء کے نسخے میں یہ عنوان نہیں ہے اس کے بجائے یہ لفظ ہیں "بعرفان نواب غلام حسین" (دیباچہ پنج آہنگ عابدی ص ۱۰)۔ مگر یہ سراسر غلط ہے "آرایش گفتار" والا عنوان ۱۸۴۰ء (نسخہ ۳) کے ص ۱۰۲ پر موجود ہے۔ یہی بات انہوں نے عنوان 'سخن در ہجرم ظلمت شب' کے متعلق لکھی ہے وہ بھی قطعی غلط ہے۔

نسخہ ۳ کے شروع (دیباچہ مرزا علی بخش خاں) کا آدھا صفحہ نہیں۔ تمام نسخہ ۱۱ سطری ہے۔ اور خوبصورت نیلی اور سرخ دھاریوں سے گھرے ہوئے حوض میں لکھا ہوا ہے۔ درمیان سے کچھ اوراق غائب ہیں ۔ اس کے باوجود مخطوطہ ۲۰۶ صفحوں کو محیط ہے (نمبر میں نے دیے ہیں) ترتیب قطعی نسخہ ۱ کے مطابق ہے۔ وہ تمام

غلطیاں جو نسخہ ۲ میں در آئی تھیں رفع کر دی گئی ہیں اور عنوانات کی خالی جگہ سرخ روشنائی سے پُر کر دی گئی ہے۔ اشعار جو نسخہ ۲ میں نثری انداز سے لکھے ہوئے تھے۔ اب نظم کے پیرائے میں ہیں۔ ص ۱۶۶ کے بعد چند اوراق (مکاتبات) غائب ہیں۔ ہر صفحے پر حوض کا بیرونی سائز تقریباً ۱۴×۲۶ سینٹی میٹر ہے اور اندرونی سائز تقریباً ۱۰×۲۱ سینٹی میٹر ہے۔ نسخہ ۲ کا سائز بھی تقریباً یہی ہے مگر اس کا حوض کا سائز معین نہیں۔

(۳) **پنج آہنگ۔ طبع اوّل**: دیگر معمولی متنی ردّ و بدل کے علاوہ (جس کا ذکر اس مقالے میں نہیں کیا جائے گا) دو باتیں خاص طور پر توجہ طلب ہیں۔ ایک تو وہی آہنگوں کی ترتیبِ نو جو پہلے بیان کی جا چکی ہے۔ دوسری متفرق نثروں اور خطوں کی تعداد۔ یعنی اب ۱۸۴۹ء میں نثروں کی تعداد بڑھ کر ۱۶ ہو گئی اور خطوں کی تعداد ۱۲۴[۱]۔ قلمی نسخہ ۲ میں صرف ۶۹ خط تھے۔ گویا ۵۵ خطوں کا اضافہ ہوا۔

یہ کتاب، اوسط تقطیع کے ۴۹۳ صفحات پر مطبعِ سلطانی میں چھپی تھی۔ خاتمے کی عبارت یہ ہے۔

"... مجموعہ نثرہائے رنگا رنگ مسمی بہ پنج آہنگ از نتائج طبع ...
... مرزا اسد اللہ خاں بہادر ... بہ تصحیح و ترتیب ...
... حکیم غلام نجف خاں بہادر کہ ارادتمندی با خانِ رفیع الشان ممدوح
مے دارند، بتاریخ سیزدہم رمضان المبارک ۱۲۶۵ھ ہجری النبوی۔
... مطابق چہارم اگست ۱۸۴۹ء عیسوی در مطبع شاہی، بقلم شکستہ
رقم احقر العباد شیخ احمد صورتِ اتمام یافت۔ نقط فقط، تم"

نسخہ مملوکہ راقم میں جگہ جگہ دو قسم کی مہریں ثبت ہیں مگر دونوں ہی ٹھیک طرح پڑھی نہیں جاتیں۔ ایک تو کسی ذاتی لائبریری کے مالک کی ہے اور دوسری کسی ریاستی

۱۔ ۱۲۸ خط میں نے خود شمار کیے تھے۔

کتب خانے کے شاہی نشان والی ہے۔ بہت کمی کے ساتھ بعض چھپے ہوئے اغلاط کی سیاہ روشنائی سے اصلاح بھی کی گئی ہے اور یہ عمل قدیم زمانے ہی کا کیا ہوا معلوم ہوتا ہے

(۴) پنج آہنگ۔ طبع دوم : یہ ایڈیشن ۱۴۴ صفحوں پر محیط ہے۔ آخر میں متن کے ختم ہوتے ہی "خاتمہ بالخیر" لکھ دیا گیا ہے۔ ضروری تفصیل سرورق پر آگئی ہے جو یہ ہے۔

"۔۔۔۔ کتاب در علمِ قواعدِ فارسی و اشتقاق و تصحیح الفاظ و انشائے رشیقہ، بر قسم مصنفّہ ۔۔۔۔ شہنشاہِ ممالکِ علوم عربی و فارسی ۔۔۔۔۔۔ میرزا محمد اسد اللہ خاں بہادر ۔۔۔۔۔ در مطبع دار السلام دہلی خاص مبینہ ۔۔۔۔ عنایت حسین، بتصحیح حضرت مصنّف ۔۔۔۔۔۔ باہتمام نور الدین احمد لکھنوی در ماہ اپریل ۱۸۵۳ء حلیہ اختتام برکشید۔ فقط۔"

اس ایڈیشن کے بعد غالب ۱۶ سال زندہ رہے اور شہنشاہِ ملک علم عربی کہلاتے رہے۔ یہ مبالغہ آرائی کی حد ہے سب جانتے ہیں کہ وہ عربی بہت کم جانتے تھے۔ اس نسخے کے آخری صفحے پر غالب کا یہ شعر حاشیے میں لکھا ہے جو اگرچہ قدیم ہے مگر بخطِ غالب نہیں ہے

دل دادہ ایم و داغِ فراواں خریدہ ایم
یک غنچہ دادہ ایم و گلستاں خریدہ ایم

ص ۳ پر ایک مہر ہے۔ صرف ۔۔۔ علی ۱۲۶۷ھ پڑھا جاتا ہے۔ یہ کتاب ۱۲۶۹ھ میں چھپی تھی۔ ظاہر ہے کسی نے وہ مہر اس پر ثبت کر دی جو ۱۲۶۷ھ میں بنائی گئی تھی۔ کسی ریاستی کتب خانے کی مہر بھی اندرونی صفحات پر لگی ہوئی ہے جو بلا تاریخ ہے۔

اس ایڈیشن میں خطوں کی تعداد بڑھا کر ۱۵ کر دی گئی ہے اور دو نثروں کا اضافہ ہوا ہے۔

(۵) کلیاتِ نثرِ غالب۔ طبع اوّل : یہ کلیات بڑے سائز کے ۲۱۲ صفحات پر محیط

ہے۔ شروع میں ۲ صفحے فہرست کے زائد ہیں اس میں پنج آہنگ ، ص ۲ سے ص ۲۲ تک ہے۔ آخر میں خاتمۂ پنج آہنگ بھی ہے۔ جو پہلی بار چھپا ہے۔ کتاب کا خاتمۃ الطبع اس طرح ہے۔

" الحمد للہ .... دریں زماں .... از متر شحات قلم ...
فخر شعرائے عرب و عجم .... اسد اللہ خاں بہادر عرف میرزا
نوشہ متخلص بہ غالب ...... چنانکہ در شانِ خود بفرماید ......

لختے ز دساتیر بود نامۂ ما
ساسانِ ششم بکار دانی مائیم

....

کلیاتِ نثر مشکبو اعنی پنج آہنگ و مہر نیمروز، دستنبو .... در
مطبع ...... منشی نولکشور .... بماہ جنوری ۱۸۶۸ء مطابق
شہر رمضان المبارک ۱۲۸۴ھ لباسِ انطباع پوشیدہ مرغوبِ
انام و مطبوع خواص و عوام گردید ۔ فقط "

اس کے بعد عیش کا کہا ہوا قطعہ تاریخ ہے اور کتاب ختم ہو جاتی ہے۔[۱] پنج آہنگ میں کچھ اور نثروں اور خطوں کا اضافہ ہوا ہے غالب کی زندگی میں چھپنے والا یہ تیسرا اور آخری ایڈیشن ہے۔ اس کے تیرہ مہینے بعد غالب انتقال کر جاتے ہیں۔

(۶) کلیاتِ نثر غالب ۱۲۸۷ھ - طبع دوم : ۱۵×۲۴ سائز کی یہ کتاب ۴۱۸ صفحات پر محیط ہے۔ یہ ذیل کے فرق کے علاوہ کلیاتِ نثر غالب طبع اوّل کی نقل ہے۔

۱ سائز چھوٹا ہے اس لیے صفحات بڑھ گئے "پنج آہنگ" ص ۲۵۴ پر ختم ہوتی ہے۔

۲ جنوری ۱۸۷۲ء مطابق شوال ۱۲۸۷ھ میں مطبع نولکشور سے چھپی۔

۳۔ چونکہ غالب کا انتقال ہو چکا تھا اس لیے ظاہر ہے کہ اس میں کے آخری دو خط منشی نولکشور نے اپنی مرضی سے بڑھا دیے۔

۴۔ آخری دو خطوں میں ایک خط 'میر غلام باباخاں' کے نام ہے اس کے آخر میں یہ جملے اردو میں لکھے گئے ہیں۔

"اڑا جاؤں کیا دیوانہ ہوں۔ لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں آپکی عنایت سے اور بزرگوں کی دعا سے خوش و خورم ہوں اور اپنی عزت و آبرو سے بسر کرتا ہوں۔ خدا ایک وقت تم کو یہاں لادے تو سب حال کھل جاوے۔ زیادہ کہنا زیادہ ہے۔ فقط۔"

۵۔ اسی نسخے میں پہلی بار ایک قطعہ (از احمد حسن خاں جوش) اردو میں بھی درج ہوا ہے ؎

بخطِ خوب کاغذ صاف پر۔ جوش بڑی صحت سے یہ لکھی گئی ہے
سنینِ طبع سالِ عیسوی میں کھو کُل نثر غالب اب چھپی ہے

۶۔ خاتمہ 'پنج آہنگ'، جو پہلی بار ۱۸۶۸ء میں چھپا تھا، میں دوسری باتوں کے علاوہ غالب نے یہ بھی کہا ہے کہ اب آئندہ سے مجھے جو کچھ کہنا ہوگا۔ وہ بیں سرسری اور تکلف سے بری اردو میں لکھا کروں گا تاکہ زندگی آسان بسر ہو۔ یہ خاتمہ اس نسخے میں بھی شامل ہے۔

مثنوی

بیانِ نمودارئ شانِ نبوت و ولایت

ماہنامہ آجکل (اپریل ۱۹۹۰ء ص ۹) میں جناب نور الحسن راشد کاندھلوی کا لکھا ہوا ایک اہم مقالہ بعنوان "غالب کا منظومہ[1] : ....." شائع ہوا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ کلیاتِ غالبِ فارسی (مطبوعہ ۱۸۶۳ء ص ۱۰۲) میں شامل مثنوی ششم 'بیان نموداری شان نبوّت و ولایت کہ درحقیقت پرتوِ نورالانوار حضرت الوہیت ست'، اصلاً غالب کی طبع زاد نہیں۔ بقول نور الحسن صاحب۔

یہ مثنوی دراصل مولانا محمد سالم (خلف مولانا سلام اللہ بن مولانا شیخ الاسلام حقّی دہلوی) کی ایک تحریر کی ترجمانی اور اس کا منظوم فارسی پیرہن ہے جو بہادر شاہ ظفر کی تعمیل ارشاد میں شعبان یا رمضان المبارک ۱۲۶۸ھ جون جولائی ۱۸۵۲ء میں منظوم و مرتب ہوئی اور بہادر شاہ کی ہدایت کے مطابق مطبع سلطانی قلعہ معلّٰی شاہ جہاں آباد (دہلی) سے اس کی اشاعت عمل میں آئی مگر تعجب یہ ہے کہ خطوط غالب میں کہیں اس منظوم فارسی کی تقدیم و

---

[1] پورا عنوان یہ ہے "غالب کا منظومہ: تحریر مولوی محمد سالم، یا مثنوی نموداری شان نبوّت و ولایت۔ وجہ تالیف، اوّلین ترتیب اور پہلی اشاعت"

جدید اشاعتوں میں اور احوالِ غالب پر دریافت معروف مآخذ میں مثنوی نموداری کی اس ترتیب و اشاعت کا کہیں حوالہ و اشارہ درج نہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اس اشاعت کے نسخے انتہائی کمیاب بلکہ معدوم و مفقود ہیں۔

مجھے اس اشاعت کا ایک صاف ستھرا عمدہ نسخہ اپنے علمی محسن وکرم فرما جناب توفیق احمد صاحب علوی کیرانوی (خیلِ خورد کیرانہ ضلع مظفر نگر یو پی) کی عنایت سے حاصل ہوا ہے ----

---

مولانا محمد سالم نے تحریک سید احمد شہید اور اس تحریک کے مخالف علماء کے درمیان متنازعہ مذہبی اسلامی چند مباحث پر ایک تحریر مرتب کی، جس میں " وہابیوں کے بڑے بڑے اور مشہور عقیدوں کی تردید تھی "۔

مولانا محمد سالم نے یہ تحریر بہادر شاہ ظفر کے حضور پیش کی اور اس مضمون کو فارسی میں نظم کرا دینے کی درخواست کی۔ بہادر شاہ ظفر نے یہ درخواست منظور فرمائی اور غالب کو جو اس وقت دربار سے وابستہ اور مہرِ نیمروز کی ترتیب میں مشغول تھے، اس خدمت پر مامور کیا۔ تعمیلِ ارشاد ہوئی اور غالب نے اس مضمون کو نظم کر کے بہادر شاہ کے ملاحظہ سے گزارا۔ بہادر شاہ کو یہ ترتیب و ترجمانی بہت پسند آئی :

" بملاحظہ اعلیٰ حضرت کیواں منزلت گزرانیده
دلپسند طبع مشکل پسند قدسی افتاده "

بہادر شاہ نے اس کی فوراً طباعت کا حکم دیا۔ اسی ارشاد کی

بجا آوری میں یہ مثنوی مطبع سلطانی سے کتابی صورت میں جلوہ گر ہوئی۔
اس اشاعت میں دو صفحے کی تمہید ہے جو مثنوی کے سببِ تالیف پر روشنی ڈالتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

بعد حمد آفریں و نعت حضرت سید المرسلین و خاتم النبیین صلواۃ اللہ علیہ و علیٰ آلہ طیبین، و اصحابہ الطاہرین، بر مرات ضمیر ارباب حقیقت و اصحاب طریقت منطبع میگرداند کہ دریں ولا سالک مسالک ہدایت ناہج مناہج شریعت، جامع معقول و منقول، حاوی فروع و اصول، مولانائے معظم و مکرم مولوی محمد سالم زاد مجدہٗ مسائل جواز استمداد از حضرات انبیاء علیہم السلام خصوصاً جناب مستطاب خیر الانام و اولیائے کرام قدس اللہ اسرارہم از روایاتِ فتاوہائے فقیہہ نگاشتہ بحضور خاقان گیتی ستان، و سلطان دارا دربان حضرت ظلِ سبحانی خلیفۃ الرحمانی ابو ظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ و سلطانہ و افاض علی العالمین برہ و احسانہ پیش کش کردہ، بنا بر نظم آں استدعا نمودہ بودند،

چنانچہ حسب الحکم قضا شیم زبدۂ سخنوراں و اسوۂ سخن فہماں نجم الدولہ مرزا اسد اللہ خان بہادر نظام جنگ در یک صد و یک بیت جملگی مسئلہ ہائے جواز استمداد وغیرہ منظوم کردہ، بملاحظہ اعلیٰ حضرت کیواں

منزلت گزرانیدند و بسیار پسند طبع مشکل پسند قدسی
افتادہ، و بتاریخ نہم شہر شوال ۱۲۶۸ھ ہجریہ مقدسہ
مطابق سال شانزدہم جلوس معلی احکام داد تدبنا
بر طبع آں در مطبع سلطانی شرف صدور یافتہ و لقالب
طبع درآمدہ است۔ والسلام علی من اتبع الہدیٰ!

مختصراً یہ کہ مولانا محمد سالم، حضرات انبیا خصوصاً حضرت خیرالانام اور بزرگانِ دین کے مسائل کا جواز، فقہی روایات سے لکھ کر، بہادر شاہ ظفر کی خدمت میں لائے اور اس مضمون کو نظم کرانے کی درخواست کی۔ چنانچہ بہادر شاہ ظفر کے فرمان سے غالب نے اس تحریر کو نظم کر کے بادشاہ کے حضور پیش کیا۔ جو انہوں نے پسند فرمائی اور ۹ شوال ۱۲۶۸ھ مطابق ۲۸ جولائی ۱۸۵۲ء کو اس کی طباعت کا حکم دیا جو مطبع سلطانی سے (قیاساً اگست ۱۸۵۲ء میں) چھپی۔

تمہید میں صرف نظم کرنے کی بات ہے مگر بقول نورالحسن صاحب عنوان میں "ترجمہ تحریر" لکھا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا محمد سالم کی اصل تحریر اردو نثر میں تھی۔ مقالہ نگار نے مولانا محمد سالم کی ذات سے بحث کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے وہ مختصراً یہ ہے۔

(ا) بحوالہ نزہۃ الخواطر مولانا محمد سالم نے اپنے عہد کے علماء سے تعلیم پائی تھی۔ حج و زیارت حرمین سے مشرف ہوئے تھے۔ اُن کی چھ تالیفات کا ذکر ملتا ہے (اگرچہ اس رسالے کا ذکر نہیں)

(ب) بحوالہ خلیق احمد نظامی، مولانا محمد سالم اور مولانا نورالاسلام کے بعد شیخ محدث کے خاندان کی علمی حیثیت تقریباً ختم ہوگئی۔

(ج) بعض شہزادوں کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کے قلعۂ معلےٰ سے قریبی روابط تھے۔

(د) معلومات و مآخذ سے معلوم نہیں ہوتا کہ مولانا "جامع منقول و معقول" اور "حاوی فروع و اصول" کہے جا سکتے ہوں۔ چنانچہ مثنوی میں جو ظاہر ہے مولانا محمد سالم کی "تحریر کا بو تمام و کمال عکس و آئینہ ہے"۔ کوئی "دلیل ایسی نہیں جسے نئی یا شرعی کہا جا سکے ...... البتہ انہیں پیش کرنے کا ڈھنگ نیا ہے [ظاہر ہے کہ یہ کمال غالب کا ہے"]

فاضل مقالہ نگار لکھتے ہیں :

مثنوی شان نبوت و ولایت میں معروف و متداول نسخوں کے مطابق کل ۱۲۸ اشعار ہیں جس میں ۲۸ شعر وہ ہیں جس میں امکان و امتناع نظیر کے موضوع پر بحث ہے، مگر زیر تعارف اولین اشاعت میں کل ۱۰۱ شعر ہیں۔ ان میں ۱۰۱ میں سے ۹۸ اشعار جوں کے توں وہی ہیں جو مثنوی کے متداول نسخوں میں شامل ہیں۔ قدیم اشاعت میں تین شعر اور متاخر ترتیب میں ۲۸ شعر ایسے ہیں، جو ان طباعتوں میں ہر ایک کو دوسری سے ممتاز کرتے ہیں۔ دونوں نسخوں کا توافق اور اتحاد :

من سبک رو ہم گراں جاں نیستم
صد نشاں پیداست بہ نہاں نیستم

پر ختم ہو گیا ہے۔ اس کے بعد پہلی اشاعت اور موجودہ نسخوں کی ترتیب الگ الگ ہے اولین طباعت میں اس شعر کے بعد یہ تین شعر اور ہیں :

"غالب آہنگِ دعا را ساز دہ — بہر ایں بحث را آواز دہ
گفتہ ام زیں پیش بیتے دلنشیں — آورم از خویش بیتے دلنشیں

بر دعا سے ختم سخن کوتاہ باد
تا خدا باشد بہادر شاہ باد"

یہ تینوں شعر بعد کی اشاعتوں میں درج نہیں اور کم سے کم مطبوعہ نسخوں میں ایسا کوئی حوالہ اور وضاحت نہیں ملی جن میں ان اشعار کے وجود یا ان کے خارج کیے جانے کا کسی نے تذکرہ کیا ہو۔ یہ تینوں شعر مثنوی نمودارِ شانِ نبوت کے دوسرے نسخوں میں شامل نہ ہونے میں تو یکساں ہیں۔ مگر ان تینوں میں سے تیسرا اور آخری شعر اس لحاظ سے منفرد ہے کہ وہ کلیات نظم فارسی کی پہلی مثنوی سرمۂ بینش میں آخری شعر اور حرف اختتام کی حیثیت سے شامل ہے۔ اس لحاظ سے محولہ بالا دو شعر غالب کے نو دریافت کلام اور کلیاتِ نظم فارسی پر ایک اضافہ شمار کیے جا سکتے ہیں۔

جیسا کہ ابھی گزرا کہ :

من سبک رو ہم گراں جاں نیستم
صد نشاں پیداست پنہاں نیستم

تک جملہ (اٹھانوے [۹۸]) اشعار اولین طباعت اور نئی اشاعت میں ایک ہیں۔ قدیم اشاعت متاخر ایڈیشنوں سے دو موقعوں پر ایک ایک لفظ کی خفیف ترمیم میں مختلف ہے۔ اگرچہ یہ کوئی بہت اہم اختلاف نہیں ہے مگر اس کو نظر انداز کیا جانا بھی قرینِ مصلحت نہیں۔ اس ترمیم و تغییر کی تفصیل اس طور ہے :

پہلی اشاعت میں درج ذیل شعر کے الفاظ یہ ہیں :

اولیا را گر گرامی داشتیم
نز پئے رومی و جامی داشتیم

متاخر طباعتوں کے دوسرے مصرع میں جامی کے بجائے شامی تحریر ہے۔ اس کے بعد درج شعر قدیم اشاعت میں اس طرح ہے :

از برائے آں کہ ایں آزادگاں
دررہِ حق جاں بجاناں دادگاں

اس شعر کے دوسرے مصرع میں بھی ایک معمولی سی ترمیم ملتی ہے۔ متاخر اشاعتوں میں "دررہِ حق" کی جگہ "از رہِ حق" قلم بند کیا گیا ہے۔ اس برائے نام اختلاف کے علاوہ ابتدائی ۹۸ اشعار میں کوئی اور اختلافِ کتابت ناچیز کی نظر میں نہیں آیا۔

زیرِ نظر اشاعت میں غالب کے اس منظومہ یا مثنوی کے لیے کوئی عنوان درج نہیں۔ اس کو ترجمہ تحریر مولوی محمد سالم سے یاد کیا گیا ہے۔ یہ طباعت کُل گیارہ صفحات پر مشتمل ہے۔ پہلا صفحہ ٹائیٹل کے لیے وقف ہے۔ دوسرے تیسرے صفحہ پر تمہید یا حرفِ آغاز درج ہے چوتھے صفحہ سے منظومہ کا متن شروع ہوا ہے اوسط خط کا مناسب قلم ہے۔ صفحہ ۴ پر پہلی سطر میں پوری بسم اللہ تحریر ہے۔ پھر دو کالمی صفحہ ہے۔ اس صفحہ پر بارہ اشعار کے لیے جگہ نکلی ہے۔ اس کے بعد صفحہ ۵ سے صفحہ ۱۰ تک فی صفحہ ۱۳ اشعار کتابت کیے گیے ہیں۔ آخری گیارہویں صفحہ پر کل گیارہ شعر درج ہیں۔ آخری شعر دو کالمی ترتیب کے بجائے ایک کالمی کتابت میں دو سطر میں لکھا ہے۔ اس شعر کی دائیں جانب آڑے قلم سے "کتبہ المذنب محمد بخش" اور بائیں طرف اسی انداز پر "سنہ ۱۲۶۹ھ" تحریر ہے۔ اس کے بعد ایک مربع نما خانہ ہے۔ اس میں تمام شد درج ہے۔ یہ اس اشاعت کی آخری تحریر ہے۔ اس کے بعد کا صفحہ جو ترتیب کی رو سے بارہواں ہونا چاہیے بالکل سادہ اور ہر قسم کی تحریر و اندراج سے معرّیٰ ہے۔

درج بالا پورا مضمون جناب نور الحسن راشد کاندھلوی صاحب کے مقالے مشمولہ آج کل اپریل ۱۹۹۰ء سے اخذ کیا گیا ہے۔ اس سے یہ قطعی طور پر ثابت ہو گیا کہ اس مثنوی کی نیو رکھنے میں (جیسا کہ مولانا حالی نے لکھا ہے اور عام طور پر مشہور ہے) مولانا فضل حق خیرآبادی کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ ہاں مثنوی کی روایتِ اول کے ۱۰۱ اشعار میں سے ۳ شعر حذف کر کے ۳۰ شعر بڑھانے کا عمل، اگر مولانا فضل حق خیرآبادی کی شہ پر روا رکھا گیا ہو تو ہو۔ مگر قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ۳ اشعار قلم زد کرنے اور ۳۰ اشعار کا اضافہ کرنے میں بھی مولانا فضل حق کا ہاتھ نہیں کیونکہ ۱۹ ستمبر ۱۸۵۷ء کو شہر دہلی واپس انگریزی فوج کے قبضے میں آیا۔ گویا ۱۸ ستمبر ۱۸۵۷ء تک جبکہ بہادر شاہ ظفر شہنشاہِ ہندوستان تھا، غالب سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ شعر

بر دعائے شہ سخن کوتاہ باد
تا خدا باشد بہادر شاہ باد

مثنوی سے خارج کر دیا جائے۔ پھر یہ بھی تو دیکھیے کہ اگست ۱۸۵۲ء اور ۱۹ ستمبر ۱۸۵۷ء کے درمیان مولانا فضل حق خیرآبادی دہلی میں رہے ہی کب تھے[1]۔ وہ رام پور میں آٹھ سال ملازم رہ کر ۱۸۴۷ء میں یہیں سے لکھنؤ چلے گئے اور شاہ اودھ کی معزولی تک وہیں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ ۱۸۵۶ء میں جب واجد علی شاہ گرفتار ہو کر لکھنؤ سے خارج کیے گئے تو مولانا لکھنؤ چھوڑ کر الور آ گئے اور بقول خود ۱۴ اگست ۱۸۵۷ء تک وہیں رہے۔ ۱۵ اگست ۱۸۵۷ء کو دہلی کے لیے روانہ ہوئے۔ مہینہ بھر دہلی میں رہے۔ وہاں زبردست انتشار کا عالم تھا۔ اس لیے۔ وہاں سے بقول خود ۱۹ ستمبر یا ۲۴ ستمبر

---

[1] لیکن یہ ثابت ہے کہ وہ وقفے وقفے پر چند دنوں کے لیے دہلی جایا کرتے تھے جیسا کہ باغ دو در ایس غالب کے ایک خط بنام تفضل حسین سے مولانا فضل حق کا دہلی میں دو ہفتہ قیام کر کے ۲ ربیع الثانی ۱۲۷۰ھ (۳ جنوری ۱۸۵۴ء) کو رام پور روانہ ہونے کا ذکر ہے۔

۱۸۵۷ء کو "خدا پر بھروسہ کر کے بیوی بچوں کو ساتھ لے کر" الور کے لیے چل کھڑے ہوئے۔
اس کے بعد مولانا ۴ سال تک (انتقال ۲۰ راگست ۱۸۶۱ء) مصائب میں مبتلا رہے
اور کبھی دہلی نہ آ سکے۔

یہ شعر ع "بر دعائے شہ ......" دیوان غالب فارسی مطبوعہ ۱۸۴۵ء (مثنوی سرمۂ بینش) میں شامل ہے[1]۔ لہٰذا قابل غور بات یہ ہے کہ ۱۸۴۵ء کا چھپا ہوا یہ شعر ۱۸۵۷ء کی مثنوی میں کیوں شامل کیا گیا؟ میری رائے میں غالب نے مولانا محمد سالم کی تحریر کا منظوم ترجمہ دل جمعی سے نہیں کیا تھا اس لیے شاہ کی مدح میں پہلے ہی کا کہا ہوا شعر آخر میں چسپاں کر کے فراغت پائی مگر جب اکتوبر ۱۸۵۸ء میں بہادر شاہ ظفر کو جلا وطن کر دیا گیا تو غالب نے خود یا کسی کے کہنے پر اس مثنوی پر نظر ثانی کی اور تین شعر حذف کر کے اور تیس شعر بڑھا کر پوری مثنوی ہتھیالی۔ پھر کسی توضیح کے بغیر اپنے کلیاتِ فارسی مطبوعہ ۱۸۶۳ء میں شامل کر لی۔

---

[1] اس شعر کا دوسرا مصرع "تا خدا باشد بہادر شاہ باد" مہر نیمروز مطبوعہ ۲۸ دسمبر ۱۸۵۴ء میں بھی شامل ہے۔

غالبؔ ۔ ارسطو جاہ ۔ نسخۂ ارسطو جاہ ۔ مہرِ نیمروز

غالبؔ اپنے خط[1] بنام جواہر سنگھ جوہرؔ مورخہ ۲۷ اپریل ۱۸۴۷ء میں لکھتے ہیں ۔

"...... اگر بنویسند یک جلد دیوان بشما فرستم تا آں را از جانبِ من بہ ہمایوں خدمت حضرت مولانا بپیش کشند و نقشِ ارادت مرا بکرسی نشانند ....

سخن دراں دیار بہر در بزند و شرف روزگار خور دراں سنجند کہ دامن حضرت مولوی معنوی دامت برکاتہ محکم گیرند ۔ باللہ ایں یگانۂ روزگار در جوانمردی و مردمی آیتے از آیاتِ پروردگار است ۔ حیف کہ ورقے از گفتار شاہوارش بمن ارمغاں نفرستادید ۔ شمارا بجان من سوگند کہ چوں ایں نامہ بشمارسد، پس ازاں کہ خواندہ باشید در آستیں بنہید و بنظر گاہ آں والا نظر یعنی مولوی سیّد رجب علی خاں بہادر برید و سلامِ من با جہاں جہاں شوق و عالم عالم آرزو باز گوئید و ایں ورق را بنظر گاہ

---

[1] باغِ دودر ۔ بتصیح و تحقیق وزیرالحسن عابدی ۔ لاہور ، ص ۱۱۶

التفات آن مخدوم قدسی صفات درآورید وآں خواہید کہ سرتاسر فرد خوانند تا پایۂ من در ارادت وعبودیت باز دانند.......

.... تو نوشتہ ای کہ مولوی سیّد رجب علی خان بہادر آئین حیدر پرستی وحیدرستائی دارد، گوئی مرا بدست دے فروختی ودلم را بنور مہروے افروختی، دانی کہ بندۂ علی ابن ابیطالبم....

... دہر کہ را مے شنوم کہ بندۂ اوست خداوند خودش مے دانم و تن بہ بندگیش مے دہم ...."

اس لمبے خط سے جو اقتباسات اوپر دیے گئے ہیں[1] ان کا خلاصہ یہ ہے:

کہ تمہارے (جواہر سنگھ جوہر کے) کہنے پر ایک دیوان (فارسی مطبوعہ ۱۸۴۵ء) تمہیں بھیجتا ہوں۔ اسے میری طرف سے مولانا (سیّد رجب علی) کی خدمت میں پیش کرنا اور میری ارادت کا ذکر کرنا........ اب تمہیں اس دیار میں در در ٹھوکریں کھانے کی ضرورت نہیں۔ اس کو خوش بختی سمجھو اور مولوی رجب علی کا دامن مضبوطی سے پکڑے رہو۔ قسم خدا کی یہ یگانۂ روزگار عالی حوصلگی اور انسانیّت میں پروردگار کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے افسوس کہ تم نے ان کی گفتارِ شاہوار سے کچھ بطورِ تحفہ مجھے نہ بھیجا۔ تمہیں میری سوگند کہ جب یہ خط ملے، پڑھنے کے بعد ایک رومال میں لپیٹ کر مولوی صاحب کے پاس لے جانا اور میرا سلامِ شوق پہنچانا اور اسے ان کی نظر سے گزارنا۔ وہ میرے خط کا لفظ لفظ پڑھیں تاکہ انہیں معلوم ہو کہ مجھے ان سے کس درجہ ارادت و

---

[1] رجب علی شاید شاعر بھی تھے۔ ان کے نام کے ساتھ علی تخلص لکھا ہوا کہیں دیکھا ہے۔

عبودیت ہے۔........ تم نے لکھا ہے کہ مولوی صاحب حضرت علی کے ماننے والے ہیں، تو اس بات نے گویا مجھے ان کا بندۂ بے دام بنا دیا۔ میں بندۂ علی بن ابی طالب ہوں اور جو ان کا بندہ ہے اسے میں اپنا خداوند سمجھتا ہوں اور اس کی بندگی میں اپنی جان دے دیتا ہوں.............................."

جب یہ خط لکھا ہے غالب پچاس سال کی عمر کو پہنچ رہے تھے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے مولوی رجب علی اور غالب کے تعلقات ایک زمانہ پہلے سے تھے اگرچہ مولوی صاحب کے نام کے خطوں میں کوئی خط اس تاریخ سے پہلے کا مجھے نہیں ملا۔

مولوی سید رجب علی انگریزی سرکار کے زبردست پٹھو تھے۔ ۱۸۵۷ء کی سعی آزادی میں وہ انگریزوں کی طرف داری میں مرزا الٰہی بخش کے دوش بدوش نظر آتے ہیں اور "قوم کشی اور وطن فروشی کی انتہائی مکروہ تصویر پیش" کرتے ہیں۔ بقول صاحب بزم غالب[1] ان کا مختصر احوال یہ ہے۔

"........ رجب علی ۱۸۰۷ء میں ضلع لدھیانہ کے ایک قصبہ تلونڈی میں پیدا ہوئے تھے۔ جب ان کی عمر دس برس کی ہوئی، اُن کا خاندان وہاں جگراؤں منتقل ہو گیا۔ جس کے بعد ۱۸۱۸ء میں وہ حصول تعلیم کے لیے لاہور بھیجے گئے۔ جہاں انہوں نے حکیم سید خیر شاہ لاہوری اور حکیم ملا مہدی خطائی سے مختلف علم و فنون میں استفادہ کیا۔ بعد ازاں ۱۸۲۵ء میں دہلی کالج میں داخل ہو کر وہیں ریاضی کے مدرس ہو گئے، لیکن ان کی یہ مدرسی زیادہ دنوں نہیں چلی، انہوں نے مدرسی

---

[1] بزم غالب۔ عبدالرؤف عروج ۱۹۶۹ء ص ۱۶۱

کو ترک کر کے ہوشنگ آباد اور پھر بھوپال کا قصد کیا اور محکمہ فتاویٰ شرعیہ میں ملازم ہو گئے۔ ۱۸۴۳ء میں اچانک بھوپال کا قیام ترک کر کے وطن کی راہ لی اور سردار فتح سنگھ کے مصاحبوں میں شامل ہو گئے۔ اسی کے چار ماہ بعد ان کو جان رسل کلارک نے انبالہ میں اپنا منشی بنا لیا۔ ۱۸۵۳ء میں انگریزوں نے ان کی بہتر کارکردگی سے متاثر ہو کر بنجراؤں کے کچھ علاقے بطور جاگیر دیے۔ اسی دوران ہنری لارنس کے ساتھ راجپوتانہ کا بھی دورہ کیا۔ غالبؔ نے ۱۲ مئی ۱۸۵۵ء کو منشی جواہر سنگھ کے نام ایک خط لکھا ہے۔

"مولوی رجب علی نے دہلی پہنچ کر کچھ دنوں قیام کیا، پھر جودھپور روانہ ہو گئے جہاں ایجنٹ راجستھان کے دفتر میں ان کا بڑا لڑکا ملازم ہے، روانہ ہوتے وقت ان کا چھوٹا لڑکا اور چھوٹا بھائی بھی ان کے ساتھ تھا، وہ واپس لوٹے تو دونوں ان کے ساتھ نہیں تھے۔ غالباً ان کو ایجنٹ راجستھان کے سپرد کر دیا ہے تاکہ ہر ایک کام سے لگ جائے ------------------------"

رجب علی نے دہلی میں اس قیام کے دوران علم الکلام کے منتہی مولوی حیدر علی سے مولوی صدر الدین آزردہ کے بالمواجہ مناظرہ بھی کیا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے دوران ان کو کمانڈران چیف کا میر منشی بنایا گیا۔ اُن کی خدمات کے صلہ میں ان کو پانچ ہزار روپے نقد اور ارسطو جاہ اور خان بہادر کے خطابات دیئے گئے[۱] ------------

---

[۱] (س) اسپیر (P. Spear - Twilight of the Mughals - Page 217) -
حکیم احسن اللہ خان کے حوالے سے لکھتا ہے "۱۲ بجے کے بعد مرزا الٰہی بخش آیا۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

"........[مقاماتِ مقدسہ کی زیارت (عراق و عرب)] سے
واپس آنے کے چند سال بعد ۱۸۶۹ء میں انتقال کیا......"

اس سے ظاہر ہے کہ ۱۸۲۵ء (قیامِ دہلی) اور ۲۷ اپریل ۱۸۴۷ء کے مابین کسی زمانے میں غالب اور مولوی صاحب میں شناسائی ہوئی ہوگی۔ شاید ۱۸۳۳ء سے کچھ عرصے پہلے، جب کہ وہ بھوپال میں مقیم تھے۔ وہاں سے وطن (پنجاب) آتے جاتے دہلی میں قیام ہوتا ہوگا۔ وہیں کہیں ملاقات بھی ہوگئی ہوگی۔ جب ۱۸۵۷ء میں مولوی صاحب کی خدمات کے اعتراف میں انگریزی سرکار نے انہیں خطابات سے نوازا اور وہ مولوی رجب علی سے "ارسطو جاہ خان بہادر مولوی سیّد رجب علی" بن گئے تو غالب نے اپنے ذاتی مفاد کے پیشِ نظر ان سے ارتباط اور بھی بڑھا لیا۔ جس کا ثبوت ان کے خطوں سے مہیّا کیا جا سکتا ہے۔

غالب نہ ہی مخبر پیشہ تھے نہ انہوں نے کبھی کسی ایسی سازش میں حصّہ لیا تھا جو ان کے ملک کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتی تاہم ان کی معزز سے معزز تر بننے کی

حاشیہ گزشتہ سے پیوستہ

اس نے ہڈسن صاحب کا دستخط شدہ پاس (پروانۂ راہداری۔ اس وقت بادشاہ مقبرے میں پناہ گزیں تھے) دکھا کر کہا کہ اگر آپ سب لوگ ہتھیار ڈال دیں اور بادشاہ پالکی میں چلیں تو انہیں (بادشاہ کو) ملکہ کے محل میں رہنے کی اجازت دے دی جائے گی...... اور کہ مولوی رجب علی ۵۰ سکھ سواروں کے ساتھ (انگریزوں کی طرف سے) مقبرے میں پہنچ چکا ہے...... مولوی (رجب علی) نے عرب سرائے کے باہر بادشاہ کی خدمت میں نذر گزرانی اور اس کا یقین دلایا۔ جیسے ہی بادشاہ کی پالکی ہمراہیوں سمیت شہر کے پاس پہنچی اور پالکی کو نیچے رکھا تو مولوی رجب علی نے ہڈسن کو اطلاع کی کہ آپ خوشی سے (بادشاہ کو حراست میں لانے کے لیے) بذاتِ خود تشریف لائیں"۔

(ب) ص ۲۵۴ پر اسپیر نے فین شا (F.C. Fanshawe – Delhi Past and Present) کے حوالے سے لکھا ہے کہ مولوی رجب علی دلّی میں برطانوی خفیہ محکمے کا سربراہِ اوّل تھا۔

شدید خواہش انہیں اکثر چاپلوسوں کے کٹہرے میں کھڑا کر دیتی تھی۔ یوں بھی وہ درباداری کا زمانہ تھا۔ وہ ۱۸۵۷ء سے پہلے بادشاہ اور انگریزی حکام کی چاپلوسی کرتے رہے اور ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزی حکومت کی۔ باوجودیکہ شاہ ظفر کا دربار "سنجر اور ملک شاہ، یا جہانگیر اور شاہجہاں" کا دربار نہ تھا، تاہم وہ چاہتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح مستقل طور پر ان کی رسائی شاہ ظفر تک ہو جائے۔ آخر کار میاں کالے صاحب (شاہ ظفر کے پیر) اور حکیم احسن اللہ خان (مدار المہام) کی سفارش سے غالب کو بہادر شاہ ظفر نے خاندانِ تیموری کی تاریخ لکھنے پر مامور کر دیا۔ دیکھیے اس خوشگوار واقعے کا ذکر وہ کیسے شاعرانہ اہتمام سے کرتے ہیں۔ ذیل کا اقتباس نسخۂ ارسطو جاہ (پوری کیفیت آگے آئے گی) سے لیا گیا ہے۔

"روزی بود فیروز و صبحی دل افروز باد در وزیدن و سبزہ در چمیدن بلبل به نواخوانی و زاہد بسبحہ گردانی رہ نوردان بار بربستہ و شبگردان پای بدامن شکستہ۔ روز از خجستگی بہ سعد اکبر نامزد و بہ پنجشنبہ نامور آمدہ و بیست و سیوم شعبان سال ہزار و دو صد و شصت و شش ہجری با چہارم جون سال ہزار و ہشتصد و پنجاہ عیسوی برابر آمدہ۔ مہر در خرگاہ ماہ میہمان و ماہ از نشیمن زہرہ میہمان را بمہر نگران کیوان بحمل در گام سنجی و برجیس بہ سنبلہ در خرامش مریخ در اسد با ناہید و ماہ و عطارد در جوزا بہ تنہائی شادمان شہنشاہ بشکوہی کہ پنداری آفتاب ست در بیت الشرف بر اورنگ نشستہ و من بہ نشاطی کہ گوئے عطارد ست در تصمیم روبرو ایستادہ کارپردازان شاہی بفرمان حضرت ظل اللہی بہ خلعت خانہ خاصم بردند قائمم را بہ خلعت شش پارچہ آراستہ بسلام گاہم آوردند خداوند دنیا و

(۱) ہو، (مہر نیم روز (متداول) سے خارج ہیں۔ ۲، ۳، میم نیم روز (متداول) میں یک ہزار۔

دین بدان دست بخشش آئین کہ کف آن دست ژرف[1] دریائیست
کہ ہفت دریا کف اوست جگر گوشہای معدن یعنی جیغہ و سرپیچ بسرم
بست و رگ[2] جان ابر نیسان یعنی مالای مروارید بگردنم آویخت،
چاوشان فرخ سروش گہرہائی ترا دیدہ رگ ابر خامہ شاہ انجم سپاہ[3]
برگوشہ بساط بارگاہ افشاند و غالب سخن سرای را نجم الدولہ و
دبیر الملک و نظام جنگ خواند بفحوای الاسماء تنزل[4] من السماء
بدین مہر خوان کہ از خرشید ذرہ پرور یافتم خود را چون گویم کہ با آفتاب
ہمآئینہ یا عطارد برابر یافتم توقیع خدمت تاریخ نویسی سلاطین تیموریہ
بنام من نگاشتند ...."

ایک دن تھا فتحمندی کا ایک صبح تھی دل کو روشن کرنے والی۔ ہوا
کا چلنا، سبزے کا لہلہانا، بلبل راگ الاپتے ہوئے اور زاہد
تسبیح پھیرتے ہوئے، (دن کے) راہ رو رخت سفر باندھے
ہوئے اور رات کے مسافر (شب بھر چل کر بوقت صبح) تھک ہار
کر سوئے ہوئے (غرضیکہ عجیب منظر تھا)۔ یہ دن مبارک کی وجہ
سے سعد اکبر کے نام سے جانا گیا اور پنجشنبہ مشہور ہوا اور ۲۳ شعبان
۱۲۶۶ھ تھا۔ جو مطابق ہے ۴ جون[5] ۱۸۵۰ء کے سورج (چاند کے خیمے
(برج ثور۔ آسمانی برج جس کی شکل گائے کی ہوتی ہے) میں مہمان تھا
اور چاند زہرہ کے نشیمن (برج حوت۔ بارہواں برج آسمانی) سے
اس مہمان (سورج) کو نگاہ مہر سے دیکھ رہا تھا۔ کیوان (ستارہ زحل)
برج حمل میں گامزن اور برجیس (مشتری) برج سنبلہ میں چہل قدمی

---

[1] اور [2] مہر نیمروز (متداول) سے خارج ہیں۔ [3] مہر نیمروز (متداول) حایل مروارید۔ [4] مہر نیمروز (متداول) بردین۔
[5] غالب سے یہ سہو ہوا پنجشنبہ ۲۳ شعبان ۱۲۶۶ھ مطابق ہے ۴ جولائی ۱۸۵۰ء کے۔

میں محو تھا، مریخ (منگل) برجِ الا میں زہرہ کا دمساز تھا اور عطارد (بدھ) جوزا (برجِ آسمانی) میں تنہائی پر خوش تھا۔ شہنشاہ ایسی شان و شوکت کے ساتھ کہ گویا آفتاب ہے، بیت اشرف میں تخت پر جلوہ فگن تھا اور میں اس خوشی کے ساتھ کہ گویا خود عطارد (بدھ) ہوں صمیمِ دل سے اُن کے روبرو کھڑا تھا۔ شاہی کارکن بادشاہ کے حکم سے مجھے خلعت خانۂ خاص میں لے گیے اور میرے بدن کو شش پارچہ خلعت سے سجاکر سلام گاہ میں لے آئے۔ دنیا و دیں کے مالک نے اُس دستِ بخشش آئیں سے کہ جس کی ہتھیلی ایسا دریا ہے کہ سات دریا اس کا جھاگ ہیں، کان کے جگر گوشے یعنی جیغہ اور سرپیچ میرے سر پر باندھے اور رگِ جانِ ابرِ نیساں یعنی موتیوں کی مالا میرے گردن میں ڈالی اور نقیبِ مبارک سروش نے شاہ انجم سپاہ کے ابرِ خامہ کی رگ سے ٹپکے ہوئے موتی بساطِ بارگاہ کے گوشے پر بکھیرے' اور غالبِ سخن سرا کا نام نجم الدولہ دبیر الملک و نظام جنگ کے خطابات کے ساتھ پڑھا .... اس خطاب سے جو میں نے خورشیدِ ذرہ پرور سے پایا کیسے کہوں کہ خود کو ہر طرح آفتاب کے ہم پلہ اور عطارد کے برابر محسوس کیا۔ بادشاہ نے تاریخ سلاطینِ تیموریہ لکھنے کی خدمت کی مہر میرے نام پر ثبت کردی ....[۲]

قصہ کوتاہ غالب ۴ جولائی ۱۸۵۰ء کو تاریخ سلاطینِ تیموریہ یعنی تاریخ تاجدارانِ تمرنژاد لکھنے پر مامور ہوے۔ امیر تیمور سے لے کر حکمرانِ عہد یعنی شاہ ظفر تک کا حال

۱۔ بحوالہ نسخۂ ارسطوجاہ (مکتوبہ تقریباً مئی، جون ۱۸۵۲ء)

۲۔ بحوالہ مکتوب بنام ارسطوجاہ مولوی رجب علی۔ مارچ ۱۸۵۲ء

لکھا جانا قرار پایا۔ گیارہ دن بعد "اسعد الاخبار" آگرہ جو ہفتہ وار چھپتا تھا، ۱۵ جولائی ۱۸۵۰ء کے شمارے میں خبر دیتا ہے[1]۔

"اِن دنوں شاہِ ایں پناہ نے جناب معلے القاب مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کو بہ فرطِ عنایت اپنے حضور طلب کر کے ایک کتاب تواریخ کے لکھنے پر جو تیمور کے زمانے سے سلطنت حال تک ہو، مامور کیا اور اس کے کاتبوں کے خرچ کو بالفعل پچاس روپیہ ماہرہ مقرر کر کے آئندہ پرورش کا متوقع کیا اور نجم الدولہ، دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ خطاب دے کر چھ پارچہ کا بیش بہا خلعت اور تین رقم جواہر عطا فرمائے۔ یقین ہے کہ تواریخ مذکور ایسی دلچسپ اور متعین عبارت میں لکھی جائے گی کہ ہر ایک اس کے لطفِ عبارت سے فیض یاب ہوگا ....؛"

مرزا نے تقریباً چھ ماہ میں تیمورؔ سے بابرؔ تک کی سرگزشت مکمل کر لی[2] اور ۲۸ مارچ ۱۸۵۱ء تک ہمایوں کا پورا حال لکھ لیا[3]۔ معلوم ہوتا ہے کہ مارچ ۱۸۵۱ء کے بعد ایک لمبے عرصے تک کام رکا رہا کیونکہ مارچ ۱۸۵۲ء میں انہوں نے جو خط مولوی سیّد رجب علی کو لکھا ہے اس میں بھی انہوں نے ہمایوں تک ہی کا حال لکھے جانے کی خبر دی ہے۔ خط کا ضروری حصہ یہاں درج کیا جاتا ہے[5]۔

"فرمان رفتہ است کہ جزوے از تاریخ تاجداران تمر خانیہ، بہ نظرگاہ آں

ل اردو۔ اپریل ۱۹۳۵ء ص ۱۹۳۔ "اب سے آدھی صدی پہلے کے اردو اخبار" از برجموہن دتاتریہ کیفی۔

ع خط بنام نبی بخش حقیر (نادراتِ غالبؔ کراچی ص ۸)، مورخہ ۲ جنوری ۱۸۵۱ء

۳۔ - - - - " " - - - ص ۱۲) ۔ ۲۸ مارچ ۱۸۵۱ء

ه کلیاتِ نثرِ غالبؔ ص ۱۱۳

والیِ ولایتِ ولاے مرتضوی فرستم۔ ذرّہ پرورا، مہرگسترا، آں سواد جُزوے چند بیش نیست۔ بعد حمد و نعت و منقبت و مدحِ والیِ عصر و سببِ تالیفِ کتاب کہ آئینِ نامہ طرازانِ ہنگامہ آراست، از کشور کشایان تا نصیر الدین سلطان ہمایوں، سخن راندہ ام، باقی داستان بہ فرداست ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

(آپ کی طرف سے) حکم ہوا ہے کہ وہ تاریخِ تاجدارانِ تمرخانیہ، کے کچھ حصے ولاے مرتضوی کی ولایت کے والی (مولوی رجب علی[1]) کی نظر سے گزارنے کے لیے بھیجوں۔ ذرّہ نواز! مہرگستر! وہ چند اجزا سے زیادہ نہیں ہے۔ حمد و نعت و منقبت اور مدحِ والیِ عصر اور سببِ تالیفِ کتاب جو ہنگامہ آرا مصنفوں کا قاعدہ ہے، کے علاوہ میں نے فاتحوں سے نصیر الدین سلطان ہمایوں تک کا حال لکھا ہے۔ باقی داستان آگے لکھی جائے گی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

پھر لکھتے ہیں کہ میں یہ اجزا جلد سے جلد بھیج دوں گا۔ اب یہ نہیں معلوم کہ انہوں نے یہاں تک کے اجزاء مولوی رجب علی کو کب بھیجے تھے۔ ۱۱ر جون ۱۸۵۲ء کا ایک خط جواہر سنگھ جوہر کے نام ہے[2]۔ لکھتے ہیں۔

"۔۔۔۔۔ مسودۂ روزنامۂ رودادِ اورنگ نشینانِ چغتائیہ بدست ہیرا سنگھ رواں داشتہ ایم و ہنوز از رسیدنش نشان نہ یافتہ ایم، اگر رسیدہ است بنویسند ورنہ از ہیرا سنگھ بازپرس کنند۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

---

[1] مولوی سیّد رجب علی شیعہ تھے۔

[2] کلیاتِ نثرِ غالب ص ۱۲۰۔

اگرچہ اس خط میں مولوی رجب علی کا نام نہیں اور یہ بھی محض مفروضہ ہے کہ جون ۱۸۵۲ء میں جو تر پنجاب ہی کے اضلاع میں تعینات تھے، تاہم معلوم ہوتا ہے کہ یہ مولوی رجب علی ہی کی فرمائش پر بھیجا ہوا مسودۂ تاریخِ سلاطینِ تیموریہ (تاریخِ تاجدارانِ تمر خانیہ) ہے جس کا تعارف آج یہاں مقصود ہے۔ اس قلمی نسخے کی ایک عمدہ عکسی کاپی جناب پروفیسر لطیف الزمان خاں (ملتان۔ پاکستان) کی عنایت سے مجھے دستیاب ہوئی اور میرے پیشِ نظر ہے۔ یہی ہے وہ اصل نسخہ (جو اب پروفیسر لطیف الزمان صاحب کی ملک ہے) جس نے بعد میں 'پرتوستان' حصّہ اوّل یعنی مہرِ نیمروز کی شکل اختیار کی۔ اگر یہ نسخہ جون ۱۸۵۲ء کو نہیں بھیجا گیا تھا تو مارچ ۱۸۵۲ء اور جون ۱۸۵۲ء کی درمیانی مدّت کا مکتوبہ ضرور ہے کیونکہ یہی وہ عہد ہے جب ردّ و بدل ہوا تھا کہ اب تاریخ، ابتدائے آفرینشِ عالم و آدم سے شروع ہو اور اس نسخے میں متن ابتدائے آفرینشِ عالم و آدم سے شروع نہیں ہوا ہے بلکہ یہ حال اس میں شامل ہی نہیں ہے۔

اِس مخلوطے پر مولوی رجب علی کے کتب خانے کی مُہر ہے جو اس طرح ہے۔

۱۲۷۵ رجب علی خان بہادر مہر کتب خانہ سیّد مولوی

اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ مخطوطے پر ۱۲۷۵ھ (۱۱ اگست ۱۸۵۸ء تا ۳۱ جولائی ۱۸۵۹ء) کی مُہر کیوں ہے جبکہ مخطوطہ ۱۸۵۲ء (۱۲۶۸ھ) سے مولوی صاحب کی تحویل میں ہے۔ اس کی ایک معقول وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ۱۸۵۷ء تک مولوی رجب علی صرف ایک بارسوخ ہوشیار، قابل اور جگراؤں (پنجاب) کے کچھ نواحی علاقوں کے جاگیردار تھے۔ مگر ان کا شمار رؤسائے پنجاب میں نہ تھا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں جب وہ انگریزی

فوج کے کمانڈر انچیف کے میر منشی بنائے گئے اور ۲۰ ستمبر ۱۸۵۷ء کو دلی پر انگریزوں کے دوبارہ قبضے کے بعد ان کی وطن فروشی (خدمات) کے عوض انہیں ارسطوجاہ اور خان بہادر کے خطابات سے نوازا گیا تو ان کا بول بالا ہو گیا اور وہ بڑے رئیسوں میں گنے جانے لگے۔ جس سے ان کی شان و شوکت میں ہمہ جہتی اضافہ ہوا۔ علم دوست تو وہ تھے ہی۔ باقاعدہ ایک کتب خانہ قائم کیا گیا۔ اور یہ سب کرتے کراتے سال بھر اور گزر گیا۔ حتیٰ کہ ۱۸۵۸ء کا اخیر (۱۲۷۵ھ) آ گیا۔ کتب خانے کی مہر بنوائی گئی اور جو کتابیں اس میں داخل کی گئیں ان پر یہ مہر ثبت ہوئی۔ آج اسی مہر کے ساتھ یہ مخطوطہ میرے روبرو ہے اور غالبیات کی تاریخ میں ایک نئے باب کے اضافے کا باعث بن رہا ہے۔ میں نے سالِ مُہر ہی کی بنا پر اور فرض کر کے کہ ۱۲۷۵ھ میں مولوی رجب علی کو ارسطوجاہ کا خطاب مل چکا تھا۔ اس مخطوطے کا نام "نسخۂ ارسطوجاہ" رکھا ہے۔

"نسخۂ ارسطوجاہ" ۱۲۲ صفحات پر محیط ہے۔ ہر صفحے پر ۱۵ سطروں کا التزام ہے۔ تمام نسخہ خوشخط نستعلیق میں لکھا گیا ہے۔ کاتب پڑھا لکھا معلوم ہوتا ہے۔ ترقیمہ یا خاتمۃ الطبع شامل نہیں۔ وجہ شاید یہ ہے کہ یہ مخطوطہ ایسی کتاب کی قلمی نقل ہے جو ابھی مکمل نہیں ہوئی۔

ابھی یہ کتاب لکھی جا رہی تھی کہ بادشاہ کی طرف سے حکم ہوا کہ اب حال ابتدائے آفرینشِ عالم و آدم سے آغاز کیا جائے۔ غالب تاریخ نویسی سے اکتائے ہوئے تھے۔ وہ مان گئے مگر اس طرح کہ اب حکیم احسن اللہ خاں اردو مسودہ بہم پہنچایا کریں گے، اور غالب اُسے فارسی جامہ پہنا دیا کریں گے۔ چنانچہ جون ۱۸۵۲ء کے بعد حکیم صاحب نے آدم سے چنگیز خان تک کا مسودہ اردو میں مہیا کر دیا جسے غالب نے فارسی میں لکھ کر کتاب میں شامل کر لیا۔ بعد ازاں تقاضوں کے باوجود حکیم صاحب نے مزید مواد مہیا نہ کیا۔ آخر کار غالب نے جو کچھ بھی لکھا جا چکا تھا۔ اسی کو ایڈٹ کر کے (تفصیل بعد میں آئے گی) کتاب کا نام "پرتوستان" رکھ دیا اور لکھے ہوئے اوراق کو حصہ

اوّل یعنی 'مہرِ نیمروز' کا نام دے دیا۔ دوسرے حصّے کا نام 'ماہِ نام ماہ' تجویز کیا تھا، مگر اس کے لکھنے کی نوبت کبھی نہ آئی۔ جس حصّے کو ایڈٹ کر کے 'مہرِ نیمروز' کا نام دیا گیا ہے، 'نسخۂ ارسطو جاہ' اسی اصل مواد پر مبنی ہے اور آج غالبیات کے شائقین کو اُس سے پہلی بار متعارف کرایا جا رہا ہے۔

غالب غیر معمولی تخلیقی اور اختراعی قوّت کے مالک تھے اور بے حد معاملہ فہم اور ذہین شخص تھے۔ انہوں نے جس طرح اصل مواد کو 'مہرِ نیمروز' میں ڈھالا ہے، وہ عمل بذاتِ خود فنِ تدوین کا عمدہ نمونہ ہے۔ الفاظ، صفحات اور اوراق میں ردّ و بدل اس خوبی سے کیا گیا ہے کہ اس نسخۂ 'ارسطو جاہ' کو 'مہرِ نیمروز' کے پیش رو کے طور پر الگ سے مکمل چھاپا جانا چاہیئے۔ فی الحال نمونتہً چند اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں۔

سب سے پہلے اوّل اور آخر دیکھیے۔

ص ۱ "آغازِ ہر گفتار کہ سرانجام آں در اندیشہ گزرد و سرانجام ہر کار کہ
خرد با آغاز آں رہ بردہ بستایش دادار دانائی بخش دارائے بسیار
دانا برگزیں دار انگاہدار نکوست، کہ بہنجار راستی و پیوند درستی
بازگشت ہر گونہ ستایش از ہر سُو ہماں بسوئے اوست (د)۔ اگر
سخن از بلندی بسپہر درمیاں انداز زند، اندازہ داں داند کہ آں بلندی
اساس پایۂ نمودگیتی ست، و اگر مہر را بروشنی انگشت نما سازند کاہ
شناس شناسد کہ ایں روشنی الف صیقل آئینۂ شہود گیست جیغہ
جیغہ کردن ابروئے ہلال بہ پرتو فشانی ستارہ ہائے شام...."

لہ ۲ھ ۳ھ میرا خیال ہے چونکہ آغاز کی عبارت میں مہر، ہلال اور پرتو جیسے الفاظ پہلے ہی سے موجود تھے۔ اس لیے غالب نے پورے پروجیکٹ کا نام پرتو کے حوالے سے پرتوستان رکھ دیا ہوگا اور مہر کے حوالے سے مہرِ نیمروز۔
(حاشیے کا بقیہ اگلے صفحہ پر)

مندرجۂ بالا اقتباس نسخۂ ارسطوجاہ سے ہے۔ یہی نسخۂ ارسطوجاہ کا آغاز ہے اور یہی مہرِ نیمروز کا، فرق صرف یہ ہے کہ مہرِ نیمروز کے لیے اوپر کی چوتھی سطر کے "لسوے اوست۔" اور "اگر" کے درمیان ذیل کے الفاظ بڑھا دیے ہیں۔

"زہے بخشایندہ پرتوستاں کشایندہ، مہرِ نیمروز نمایندہ ماہِ نیم ماہ آرایندہ"

(واہ وا۔ کیسا بخشنے والا، پرتوستاں کھولنے والا، مہرِ نیمروز (دوپہر کا سورج) دکھانے والا، ماہِ نیم ماہ (چودھویں کا چاند) کی آرایش کرنے والا ....)

اب نسخۂ ارسطوجاہ کے آخری دو صفحات ملاحظہ فرمائیے۔

ص ۱۲۱ "کہ ایں فرزانۂ ناز پرور دیرینی جہاں را ازاں پنجاہ[۵۱] و یک سال کہ در گلگشت ایں شش درہ بوستان گزشت بست[۲۴] و چہار سال بفرمان دہے شاہنشہے کابل و ہندوستان گزشت در دہلی تو کہ اکنون کہن است خواب گاہش ساختہ اند و ایں گنبد کہ سر بہ ستارہ میساید بقول صاحب تاریخ فرشتہ در سال[۹۷۳] ہفتصد و ہفتاد و سہ افراختہ اندیشہ مستی عدلے دہر زہ گردی افغانان دیگر و گرمی بازار ہیموں ہنوز برجاست تا در عہد بادشاہ جواں دولت جواں سال از آنہا چہ سخن زود، ....، دیدہ وراں بد الغریبی ایں گزیں روش کہ خامہ را در بنان من است اگر بہ برتش دید از روش فرسودۂ فردتی داد از دیدہ وراں خواہم از دیدہ وری

(گزشتہ سے پیوستہ): اور علاوہ (تیسری تک کا نیا چاند) کا دوسرا سرا ماہ نیم ماہ (چودھویں کا چاند) ہی ہوتا ہے۔ غالب جیسے تخلیقی ذہن رکھنے والے کے لیے ایسے الفاظ سے فائدہ اٹھانا معمولی بات ہے۔

نخواہد بود نہ از فرزین سرے، کالا شناسی را نداں آئین است
کہ نکوئی کالای خویش از نظر اندازند و بر کار کشائی را نہ آن دستور
است کہ بہر پیکرے کہ خود کشند عشق نبازند مگر مانی آن نقش را کہ
خود میز دا ز اعجاز نمی شمرد، و آذر آن بت را کہ خود می تراشید
نماز نمی برد، یزدان را بندہ سپاس گزار باشم اگر قلم را بہر
جنبش آفرین نگویم و از سخن بہر اندیشہ سپاس نپذیرم رفتار
کبک فند رود دل از دست برد و خرام این رعنا لعبت رقاص
سرمست بکنند۔

ص ۱۲۲ حاشا کہ خرامش کلک بر ورق ایمایہ دلاویز و ذوق انگیز تواند بود،
تیر است کہ بسنبلہ در حالت سرمستی تصمیم خود نمایانہ بنیاز
میخرامد این پارسی آمیختہ بہ تازی کہ از زمان چیرہ دستی عرب بر عجم
در گیتی بدید آمد خسروی گنجینۂ در بستہ بود کہ خامۂ من قفل درش
را کلید آمد پرویز کجاست تا بنگرد کہ دریں رہ بردے کدام راہ سپردہ ام
و بہرام کجاست تا فرا رسد کہ سخن را از کجا بکجا بردہ ام بیت،
خسروی بادہ دریں دور اگر میخواہے بیش ما آی کہ جرعۂ از جامی ہست"

نسخہ ارسطو جاہ اس شعر پر ختم ہوتا ہے مگر مہر نیمروز، اس سے کہیں پہلے مندرجہ بالا
اقتباس کی آٹھویں سطر کے ان الفاظ پر رک جاتی ہے "...... از آنجا چہ سخن رود" اور
اس کے آگے یہ عبارت اضافہ کرکے کتاب کا خاتمہ بالخیر ہو جاتا ہے۔

"ہمانا پرتو فشانی مہر نیمروز در پرتوستان انجام یافت۔ امید کہ
زود نہ دیر ہنگامۂ تابش ماہ نیم ماہ گرم شود ......"

نسخۂ ارسطو جاہ اور مہر نیمروز کے اشعار میں بھی ایک گونہ اختلاف ہے۔ ذیل
میں وہ اشعار دیے جاتے ہیں جو مہر نیمروز (متداول) میں ہیں مگر نسخۂ ارسطو جاہ میں

شامل نہیں ہے

مطلع

در عدم پندار پیدای سیلماں زاستی
آہ ازیں عالم گر شش در چشم موری جاستی

رُباعی

اے کردہ بآرایش گفتار بسیچ | در زلف سخن کشودہ راہ خم و پیچ
عالم کہ تو جیز دیگر ش میدانی | ذاتی ست بسیط متبسط دگر ہیچ

فرد

لفظ و معنی را بدانش وادرس | احترام الدولہ عیسے نفس

فرد

بداں غلط کہ ز آدم محمد است مراد | ز پشت کار تمر خاں بہ تست روی حکیم

مصرع

تا خدا باشد بہادر شاہ باد

بیت

بنام آنکہ گر نگست در بوست | بغیر از وہم نبود ہر چہ جز اوست

فرد

پشہ کے داند کہ ایں باغ از کے است | در بہاراں زاد و مرگش در دے است

نظم

ہمدرین فصل کہ مستانہ سخن میگذرد
نکتۂ چند سرایم ز وجوب و امکان

صور کون نقوش است و ہیولی صفحہ
صفحہ عنقا است چہ گوئی ز نقوش امکان

ہستی محض تغیر نپذیرد زنہار
حرف، آلان کما کان، ازین صفحہ بخوان

ہمچنان در تتق غیب نمودی دارند
بوجودیکہ ندارند ز خارج اعیان

پرتو لمعہ ندانی کہ بود جز خورشید
موج و گرداب نسنجی کہ بود جز عمان

عالم از ذات جدا نبود و نبود جز ذات
ہمچو رازیکہ بود در دل فرزانہ نہان

نتوان گفت کہ عین است جز این نتوان گفت
صور علمیہ کز علم نیاید بہ عیان

فرد

عقل در اثبات وحدت خیرہ مے گردد چرا
ہرچہ جز ہستی ست ہیچ و ہرچہ جز حق باطل است

مصرع

دانی ہمہ اوست ور ندانی ہمہ اوست

مطلع

سخن دوست گران بود فراوان کردم
جان بہ بیعانہ بیار بدکہ ارزان کردم

مصرع

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

غزل

حق جلوہ گر ز طرز بیان محمدؐ است
آری کلام حق بزبان محمدؐ است

آئینہ دار پرتو مہرست ماہتاب
شان حق آشکار ز شان محمدؐ است

تیر قضا ہر آئینہ در ترکش حق است
اما کشاد آن ز کمان محمدؐ است

دانی اگر بمعنے 'لولاک' وارسی
خود ہر چہ از حق ست از آن محمدؐ است

ہر کس قسم بدانچہ عزیز ست میخورد
سوگند کردگار بجان محمدؐ است

واعظ حدیث سایۂ طوبیٰ فرو گزار
کاینجا سخن ز سرو روان محمدؐ است

بنگر دو نیمہ گشتن ماہ تمام را
کان نیمہ جنبشی ز بنان محمدؐ است

ور خود ز نقش مہر نبوت سخن رود
آن نیز نامور ز نشان محمدؐ است

غالب ثنای خواجہ بیزدان گذاشتم
کان ذات پاک مرتبہ دان محمدؐ است

نظم

زہے نامور پایۂ سرفراز سراپردۂ خلوتستان راز

سررشتۂ نازشش چون وچند به پیوند ہستی بدان پایہ بند

دو گیتی نمایش ز صبحش دمی خود آن صبح را ہر فلک شبنمی

زدیز و پرستان بہر سرزمیں بود سجدہ آنجا جو سر بر زمیں

فرد

چارہ در سنگ و گیاہ و رنج با جاندار بود بیش ازان کان در رسد این امتہیا کردہ ای

مصرع

بہ لیلی ہرچہ ماند عین لیلی ست

مصرع

خودی کند خرام و خود از دست مے رود

فرد

حسرت بوے ترا حور تلافی نہ کند از تو آخر بچہ امید شکیبا باشم

فرد

ذوقیست ہمدمانِ بغنان بگذرم ز رشک خارِ رہت بپاے عزیزان خلیدہ باد

فرد

دلِ مایوس را تسکین نمودن می توان دادن چہ امید است آخر خضر و ادریس و مسیحا را

فرد

شوکت از سنگدلیہاے تو گریدکہ چو ابر گرمیِ باطنش از آتش سنگ یدہ است

نظم

خیز تا بنگری بشاخ نہال		طوطیان زمردین پر و بال
گاہ مرجان دمانده از منقار		گہ زبرجد فشانده از پر و بال
ہمہ آہنگ ساز و زمزمہ سنج		ہمہ دستانسرای و پرده سگال
زان مسیحی دمان خضر لباس		زان بہشتی وشان حور مثال
نشنوی یک ترانہ کش نبود		شور گلبانگ دیگر از دنبال
کف زدن ساز کرده برگ درخت		رقص آغاز کرده باد شمال
طوطی و طوطی و نوا و ہوا		نبود جز ترنم اطفال
نے کلک من آن نہالستی		دیں معانی طیر فرخ فال
گفتہ باشی کہ خامۂ رقاص		خشک نے پاره ایست ہیچ مبال
لغز گفتی و تن زدم آری		نتوان جست کار ریشہ زنال
نطقم انداز نخل بندی کرد		رست سروے بسر زمین خیال

فرد

ریز و آں برگ و آں گل افشاند		ہم خزاں ہم بہار ور گذرست

نظم

شبانگہ ببوے خوش انگیختن		سحرگہ لبشریت بر آمیختن
گرافتد برایشاں سر سوزنی		دہن را کشایند چوں روزنی

مصرع

ہر کرا پنج روز نوبت اوست

فرد

غم چو بہم در افگند دو کہ مراد میدہد		دانہ ذخیره میکند کاہ بباد میدہد

نظم

چه دختر خوش تر از هفتاد فرزند | نکو روے و نکو خوے و خردمند
جم و اسکندر و آئینه و جام | سراپا مردمی آن تقوا تمام

فرد

هفت اختر و نه چرخ خود آخر بچه کاراند | بر قتلِ منِ این عربده بایار روانیست

نظم

باز باطراف باغ آتش گل در گرفت | مرغ بر رسم مغان زمزمه از سر گرفت
سبزه بر اندام خاک حله ز مخمل برید | مهر بدیدار باغ آئینه در زر گرفت
گلبن افسرده را روح بقالب دوید | سبزهٔ پژمرده رانامیه در بر گرفت
دشت به پرکار باد طرح صنم خانه ریخت | باد بر اطراف دشت صنعت آزر گرفت
سرو ببالای سرو طره ز سنبل فگند | گل بتماشای گل دیده ز عبهر گرفت
قامت رعنای سرو پردهٔ گلبن درید | عارض زیبای گل دل ز صنوبر گرفت
گرچه گل از هر زمین تخت گهی برگزید | لیک بسیر ہنگیش سبزه سراسر گرفت
بسکه نیامد فرو سر بگهر گشتنش | قطره ز بالا دوی ہیئت اختر گرفت
مهر بسودای تاک لمعه زکان باز چید | از زر اصفر گذشت بادهٔ احمر گرفت

فرد

یاسمن ز جانگزای خواهش نجات داد | دردِ مرا بداغ دوا کرد روزگار

نظم

شہنشاه دانا دل و دیده ور
که چون لعل بودی سراپا جگر

بران شد که لشکر فراز آورد
بسوی ختا ترکتاز آورد

ز مردان و گردان و گند آوران
به جنبش در آورد کوہی گران

ازاں رو کہ بایست خونریز شد
منش با بخون ریختن تیز شد

دلیران ز دشمن کشی دم زدند
ز دم باد بر روی پرچم زدند

ز تاتار تا گرد انگیختند
بہ بنگاہ خان ختا ریختند

مصرع

بر تخت پشت پاز دو بر تاج دست رو

مصرع

تاج بر سر نہاد و پاے بہ تخت

نظم

دیگر بدان ادا کہ وزد در بہار باد
دارد بپویہ کلک مرا بے قرار باد

وقتست کز تراوش شبنم ز جوش مہر
گوہر فشان شود بسر سبزہ زار باد

وقتست کز شگرفی آثار نامیہ
بندد حنا ز لالہ بدست چنار باد

وقتست کاورد زره آورد نوبهار
بی جام و آبگینه می بی خمار باد

با محتسب بگوی که مستی گناه نیست
زین پس بجای باده خورد باده خوار باد

از گونا گون شقایق و از رنگ رنگ گل
زد نقش های بوقلمون صد ہزار باد

سنبل چرا ز غصه بپیچد بخویشتن
کش جز بہ سبزگی ننهند در شمار باد

بنگر تماشش سبزه که با قدر دای خضر
بی آنکه پود را بہم آرا بہ تار باد

نی باد بلکه خود دم جان بخش عیسویست
نامش نهاده اند درین روزگار باد

زان رو که چار سوی جهان را فرو گرفت
ماند بہ پرچم علم شہریار باد

اب وہ اشعار دیکھیے جو نسخۂ ارسطو جاہ میں ہیں مگر مہر نیمروز (متداول) سے حذف کر دیے گئے ہیں :-

فرد

بُرد آدم از امانت ہرچه گردوں برنتافت ریخت مے برخاک چوں در جام گنجایش نداشت

ابیات

با چنین ہنگامہ در وحدت نمی گنجد دوئی
مردہ را از خویش در پای گران انداختہ

نقش بر خاتم ز حرف بی صدا انگیختہ
شور در عالم ز حسن بے نشان انداختہ

جادہ پیمایان راہش نہ فلک را چون جرس | در گلوی نا نغمہ ہای کاروان انداختہ
گلخن افروزان داغش ہست گلشن را چو خس | در گزار نالہ آتش فشان انداختہ

بیت

آسماں پایہ جمس تا مس آن قلزم فیض | باد جالیش بجہاں تا بجہاں جا ماند

نظم

نبوت دراندیشہ تا نقش بست | نزول و عروجی بہم داد دست
سر آغاز قوس نزول آدم است | خداد کنذا نخستین رسول آدم است
جہان بود از کار فرما تہی | بآدم کہ دکنذا دند فرماندہی
زبہروی آورد اشجار بار | دی آورد دکنذا گیا مایہ کار
بہ یزدان پرستی شد او رہنمائے | زہی گیتی آرای گیتی دکنذا اے

نظم[ا]

بہ بے برگیم گلفشاں بودن ست | بہ دم سردی آتش زباں بودن ست
ولے تاب در خود نیابم کنوں | سر ریز قلم برنتابم کنوں

ایک اور نمایاں فرق مضامین کے عنوانات میں ہے۔ نسخۂ ارسطوجاہ میں صرف یہ عنوان ملتے ہیں۔

۱	ص ۱	آغازِ سرگفتار ..... (آغاز مگر بے نام)
۲	۷	زمزمۂ نعت
۳	۱۵	ترانۂ مدح
۴	۱۹	خطابِ زمیں بوس
۵	۲۶	اندازِ فتح الباب وطرازِ عنوانِ کتاب

ا۔ نسخۂ ارسطوجاہ میں اس نظم کے کل ۱۱ شعر ہیں۔ ۹ شعر مہر نیمروز (متداول) میں شامل کیے گئے اور یہ دو شعر حذف ہوئے۔

۶	۵۷	نوا بخشی شنیدن بگفتن داستان جہانگردی و جہان گیری خسرو مرتخ سلاح مہر کلاہ ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ
۷	۸۲	ارزش افزون خامہ و آمہ بہ نگاشتن حال فرخی فال جہانباں جنت نشاں نصیر الدین محمد ہمایوں بادشاہ غازی

اس کے برعکس مہر نیمروز میں ذیل کے عنوانات ہیں۔ دونوں میں فرق اظہر من الشمس ہے۔

۱	آغاز	۱۱	پرتو مہر نیمروز از فروغ گوہر بیسوکا بہا درتا درخشندگی جوہر تیغ چنگیز خان
۲	زمزمۂ نعت	۱۲	پرتو مہر نیمروز در وزیدن نسیم نوروزی بہ جنبش پرچم لوای جہان کشائی سپہبدی قراجار نویان تا زرین کلاہی و شہنشاہی صاحب قران اعظم امیر تیمور جم حشم
۳	ترانۂ مدح		
۴	خطاب زمین بوس		
۵	سبب تالیف کتاب و انداز فتح الباب		
۶	آغاز پرتو فشانی مہر نیمروز در باز نمود پیدائی طلسم شب و روز		
۷	نشان ہستی آدم		
۸	پرتو مہر نیمروز از دارائی ترک ابن یافث تا قہرمانی منگلی خان	۱۳	پرتو مہر نیمروز در ورق گردانی داستان جہانگردی و جہانگیری خسرو مرتخ سلاح مہر کلاہ ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ
۹	پرتو در فراوانی وجود ایلخان تا فر شہود بایسنغر خان		
۱۰	پرتو دیگر در بلندی رایت اقبال تومنہ خان تا عالم آرائی جہانبان برتان بہادر	۱۴	پرتو مہر نیمروز در نموداری حال فرخی فال جہانبان جنت آشیان نصیر الدین محمد ہمایوں بادشاہ غازی

اِستدراک

اب پروفیسر لطیف الزماں خاں (ملتان۔ پاکستان) نے نسخۂ ارسطو جاہ کے بارے میں مزید معلومات بہم پہنچائی ہیں جو فوٹو کاپی میں نہیں آسکتی تھیں۔ وہ یہ ہیں :

۱۔ کاغذ معمولی ہے۔ رنگ میلا ہے، نیا ہوگا تو بادامی رہا ہوگا۔

۲۔ جگہ جگہ سے کیڑوں نے کھالیا ہے مگر الفاظ صاف پڑھے جاتے ہیں۔

۳۔ خط معمولی ہے مگر رموز و اوقاف کا خیال رکھا گیا ہے۔ صاف ہے۔

۴۔ گ کا اوپری مرگز سرخ روشنائی سے لکھا گیا ہے اور واو عاطفہ بھی سرخ روشنائی میں لکھا ہے۔ زیر، زبر، پیش بھی سرخ ہیں۔ کہیں کہیں سُرخ روشنائی استعمال نہیں بھی کی گئی۔

۵۔ رسولؐ اللہ کا نام جہاں آیا ہے۔ سبز روشنائی سے لکھا گیا ہے۔

۶۔ یائے معروف یائے مجہول میں فرق روا نہیں رکھا گیا۔

۷۔ گزشت اور گزاشت کو ہر جگہ ذال سے لکھا گیا ہے۔

۸۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بعض جگہ غالبؔ نے خود تصحیح کی ہے مگر وثوق سے نہیں کہا جاسکتا۔

غالبؔ کی زندگی میں مہرِ نیم روز کی اشاعتیں

غالبؔ ۱۵ ستمبر ۱۸۵۴ء کے خط بنام نبی بخش حقیر میں لکھتے ہیں[1]۔

"میں نے اب کے عید کو قصیدہ نہیں لکھا۔ ایک مجلد اس تاریخ کا تمام کر کر وہ نذر کیا۔

اس کا حال سنیے کہ وہ صورت جو پہلے تھی۔ وہ نہیں رہی آگے آغاز امیر تیمور کے حال سے تھا اب شروع تحریر آفرینش عالم و ظہور آدم سے ہے۔ میں نے کتاب کا نام "پرتوستان" رکھا اور دو مجلد پر منقسم کیا۔ پہلا مجلد ابتدائے عالم سے حضرت نصیر الدین ہمایوں تک اس کا نام 'مہر نیم روز' رکھا۔ دوسرا مجلد جلال الدین اکبر کے حال سے حضرت والی عصر تک۔ اس کا نام "ماہ نیم ماہ"۔ سو وہ 'مہر نیم روز' تمام ہوا اور نذر حضور (بہادر شاہ ظفر) کیا۔"

اب مختصراً "مہر نیم روز" کی توقیت[2] بھی ملاحظہ کر لیجیے۔

---

[1] نادراتِ غالب۔ مطبوعہ کراچی ۱۹۴۹ء ص ۶۳ (مکتوبات)

[2] تفصیل کے لیے دیکھیے ذکر غالب پانچواں ایڈیشن ص ۱۴۵ تا ۱۴۶

۱۱ر جولائی ۱۸۵۰ء : مرزا غالب خاندانِ تیموری کی تاریخ لکھنے پر مقرر ہوئے۔ شاہ ظفر کا حکم تھا کہ صرف خاندانِ تیموری کی تاریخ یعنی امیر تیمور سے لے کر حکمران عہد تک کے حالات لکھے جائیں۔

جنوری ۱۸۵۱ء : تیمور سے بابر تک کی سرگزشت مکمل۔

مارچ ۱۸۵۱ء کے آخر تک۔ ہمایوں کی جلاوطنی اور واپسی تک کا بیان مکمل۔

مارچ ۱۸۵۲ء تک کام رُکا رہا۔

مارچ تا جون ۱۸۵۱ء : ہمایوں کے سال کے بعد مرزا نے حکیم احسن اللہ خاں سے کہہ دیا کہ مجھ سے انتخابِ حالات ممکن نہیں۔ آپ مسودہ اردو میں لکھوا کر میرے پاس بھیج دیا کیجیے۔ میں اسے فارسی کر دوں گا۔ حکیم صاحب نے اسے قبول کیا۔ اب سال بھی ابتدائے آفرینش عالم و آدم سے حکمران عہد تک۔ لکھنا تھا۔ چنانچہ اس انداز کا مسودہ مرزا کے پاس بھیجا۔ گویا اب مرزا کو ایک اور کتاب لکھنی پڑتی۔ انھوں نے بچ کر آدم سے لے کر چنگیز خاں تک کا مسودہ (کیونکہ یہیں تک کا مسودہ حکیم صاحب نے اردو میں بھیجا تھا) حکیم صاحب کے حوالے کیا۔ اس پر ایک چھوٹا سا دیباچہ لکھا اور عبارت کا انداز بھی بدل دیا۔

جون ۱۸۵۲ء تا ۱۰ر اپریل ۱۸۵۳ء : اس مدت میں اس تاریخ نویسی پر کوئی اضافہ نہ ہو سکا۔ کیونکہ تھا نشے ؟ وجہ حکیم صاحب نے اردو مسودے کے مزید اوراق مہیا نہیں کیے۔

اگست ۱۸۵۴ء : کتاب مکمل ہو گئی

(میرے کتب خانے میں مہر نیمروز کا ایک نسخہ جمعہ ۷ر ذیقعدہ ۱۲۷۰ھ ۱۲ر اگست ۱۸۵۴ء کا قلمی موجود ہے۔ جس کے حاشیوں پر

کم از کم ۵۵ عبارتیں غالبؔ کے قلم سے ہیں)

ستمبر ۱۸۵۴ء : عید قرباں پر حضورِ شاہ میں نذر کی گئی۔

۲۴ ستمبر ۱۸۵۴ء تا ۱۳ ستمبر ۱۸۵۵ء : فخر المطابع سے حسب الحکم مرزا فخرو ولی عہد ظفر ۱۲۷۱ھ شائع ہوئی بار اوّل۔

میرے یہاں وہ نسخہ موجود ہے جو غالبؔ نے نواب ٹونک کو بھیجا تھا۔ وہ نسخہ ۷ مارچ ۱۸۵۵ء کو نواب ٹونک کے کتب خانے میں داخل ہوا۔ اس سے ظاہر ہے کہ مہر نیمروز پہلی بار ستمبر ۱۸۵۴ء اور ۷ مارچ ۱۸۵۵ء کی درمیانی مدت میں طبع ہوئی۔

۱۸ نومبر ۱۸۵۸ء : خط بنام منشی شیو نرائن آرام (آرام نے چاہا تھا کہ 'مہر نیمروز' دوبارہ چھاپی جائے اور غلطی سے اس کا نام 'ماہِ نیم ماہ' لکھ دیا تھا) مرزا اس خط میں لکھتے ہیں "مہر نیم ماہ نہیں اس کا نام مہر نیم روز ہے اور وہ سلاطینِ تیموریہ کی تواریخ ہے۔ اب چھپانے کے لائق ہے، نہ چھپوانے کے قابل"۔

اوپر بیان کیے گئے حالات سے جو مختصر نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ پہلے شاہ ظفر نے تاریخِ تیموریہ کو امیر تیمور سے شروع کر کے اپنے عہد تک لکھوانے کا ارادہ کیا تھا۔ پھر اُسے بدل کر آغازِ آفرینشِ عالم و ظہورِ آدم سے شروع کرنے کا حکم دیا۔ اب غالبؔ نے اس رد و بدل کے بعد تاریخ کا خاکہ دو حصوں میں بنایا۔ پوری کتاب کا نام "پرتوستان" رکھا، حصّہ اوّل (ابتدائے عالم سے ہمایوں تک) کو مہر نیمروز کا نام دیا اور حصّہ دوم (اکبر سے ظفر تک) کو ماہِ نیم ماہ کا۔ شاید حکیم احسن اللہ خاں نے مئی ۱۸۵۰ء تک کوئی اور مسودہ مرزا کو نہیں پہنچایا۔ اس لئے 'ماہِ نیم ماہ' لکھنے کی نوبت نہ آئی۔ مگر "پرتوستان" حصّہ اوّل یعنی مہر نیمروز ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۴ء/۱۸۵۵ء) یعنی ۱۸۵۴ء کے آخر تک بحکم مرزا فخرو ولی عہد شاہ ظفر فخر المطابع سے شائع ہوگئی اور مرزا کی زندگی میں 'مہر نیمروز' ایک ہی مرتبہ چھپی

مگر میرے کتب خانے کے غالبؔ کلکشن میں مہرِ نیم روز طبع اوّل کے کم از کم چار مطبوعہ نسخے (م۱، م۲، م۳، م۴) ہیں جو بظاہر ہر لحاظ سے طبع اوّل کہے جانے کے مستحق ہیں مگر ان میں کچھ صفحات ایسے ہیں جن کا ایک ساتھ ایک مطبوعہ ایڈیشن میں چھپنا، کسی طرح ممکن نہیں۔ تاہم ان نسخوں کا کم و بیش تین چوتھائی حصہ وہی ہے جو ایک ہی ایڈیشن کا ہے اور سب میں مشترک ہے۔ اب اس سلسلے میں سب سے بڑی مشکل یہ پیش آسکتی تھی کہ فرق دکھانے کے لئے اساسی نسخہ کسے مانا جائے لیکن خوش قسمتی سے مطبوعہ نسخہ م۱ میرے یہاں موجود ہے۔ یہ وہی نسخہ ہے جو غالبؔ نے اپنے قلم سے تصحیح کر کے والیِ ٹونک کی خدمت میں طالع یار خاں کے ذریعے بھیجا تھا جو ۲۷ رجمادی الثانی ۱۲۷۱ھ (۱۷ مارچ ۱۸۵۵ء) کو والیِ ٹونک کے کتب خانہ میں داخل کیا گیا تھا، چونکہ طبع اوّل کا اب تک کا دریافت شدہ اس سے زیادہ مستند کوئی دوسرا نسخہ میرے علم میں نہیں ہے، لہٰذا باقی نسخوں کا مقابلہ اسی نسخے سے کیا جائے گا۔

نسخۂ اوّل : اس کی ترتیب اس طرح ہے :

سرورق ص ۱

آغاز متن ص ۲

خاتمہ بالخیر ص ۱۱۳

صحیح نامہ ص ۱۱۴

نظم (قطعہ تاریخ نیّرِ درخشاں) ص ۱۱۵ و ۱۱۶

یہ اب تک کا دریافت شدہ مستند ترین نسخہ کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اُسے غالبؔ نے خاص طور پر مزین و مجلّا کر کے اور بہت سی جگہ پر اپنے قلم سے اصلاحیں کر کے اور حاشیوں میں اضافہ کر کے نواب وزیرالدولہ والیِ ٹونک کو نذر کیا تھا۔ نسخے کے آخر میں ٹونک راج کے لائبریرین نے لکھا ہے :

"ایں کتابِ تاریخ "مہرِ نیم روز" بتاریخ بست و ہفتم جمادی الثانی

۱۲۷۱ھ معرفت طالع یار خان صاحب فرستادۂ غالبؔ در
کتب خانہ حضور بطور نذر داخل شد۔"

نسخۂ دوم: یہ نسخہ ص ۱۱۰ تک قطعی نسخہ ۱ کے مطابق ہے ص ۱۱۱ سے نسخہ ۱ کا، ص ۱۱۱ تا ص ۱۱۳ تک یعنی تین صفحوں کا مواد نسخہ ۲ میں دو صفحوں ص ۱۱۱ اور ص ۱۱۲ ہی میں سمیٹ لیا گیا ہے۔ گویا اس میں خاتمہ بالخیر ص ۱۱۳ پر ہے اور نسخہ ۲ میں ص ۱۱۲ پر۔ نسخہ ۲ کا ص ۱۱۳ خالی ہے اور ص ۱۱۴ کا صحیح نامہ بعینہٖ وہی ہے جو نسخہ ۱ کے ص ۱۱۴ کا ہے۔ ص ۱۱۵ اور ص ۱۱۶، یعنی تیر و دخشاں کی نظم تاریخ یا حذف کر دی گئی ہے یا پھٹ چکی ہے۔ مگر پھٹے ہوئے ورق کے کوئی آثار باقی نہیں۔

نسخۂ سوم: یہ نسخہ مطابق نسخہ ۲ کے ہے۔ فرق یہ ہے کہ صحیح نامہ کا ایک ورق جس کا ص ۱۱۴ نسخہ ۱ اور نسخہ ۲ کے عین مطابق ہے کتاب کے آخر کے بجائے آغاز کتاب یعنی سرورق سے پہلے لگا یا گیا ہے اور اس کا دوسرا صفحہ خالی ہے۔ نسخہ کی قدامت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک مہر کے مطابق جو ص ۲ پر ثبت ہے یہ نسخہ ۱۲۶۵ فصلی میں کسی سید محمد سعید صاحب کی ملک تھا۔

نسخۂ چہارم: اس نسخے کے سرورق کی عبارتیں وہی ہیں جو صفحہ ۱ کی ہیں مگر نقش و نگار میں فرق ہے۔ "شیخ خدا بخش مصوّر کی جگہ" خدا بخش" مرقوم ہے۔ حروف کی نوک پلک میں نمایاں فرق ہے۔ پہلے تین نسخوں کے ص ۲ پر اوپر کے آدھے حصے میں بیل بوٹے ہیں مگر اس نسخے میں اس صفحے پر بیل بوٹے ہیں ہی نہیں۔ پہلے ۱۶ صفحے تک تقریباً ہر صفحہ پر لفظوں کی بناوٹ میں کہیں نہ کہیں کچھ فرق ہے۔ اگرچہ الفاظ، سطریں وغیرہ نسخہ ۱ کے عین مطابق ہیں۔ پھر ص ۱۷ سے ص ۱۱۰ تک یہ سو فی صد نسخہ ۱ کے اوراق ہیں مگر اس کے بعد ص ۱۱۱ تا ص ۱۱۳ نسخہ ۱ کے مطابق بھی ہے اور ص ۱۱۱ تا ص ۱۱۲ نسخہ ۲ اور نسخہ ۳ کے مطابق بھی مجلد ہیں۔ پھر ص ۱۱۶ تک سرِ مو نسخہ ۱ کے مطابق ہے گویا اس نسخے میں مہر نیمروز کے طبع اول کی تین مطبوعہ روایتیں موجود ہیں اور چوتھی روایت خود یہ نسخہ ہے۔ کیا اس سے یہ

نتیجہ نکالا جائے کہ کیا پرتوستان (حصۂ اوّل) موسوم بہ مہرِ نیم روز پہلے ہی سال میں چار بار چھپی تھی؟

استدراک

(۱) مہرِ نیم روز کے خوبصورت مصوّر سرورق کے اوپری حصّے پر مہرِ دفترِ خاص ولی عہد بہادر ۱۲۶۸، مطبوعہ ہے۔ ۱۲۶۸ھ مطابق ہے۔ ۲۷ر اکتوبر ۱۸۵۱ء تا ۱۴ر اکتوبر ۱۸۵۲ء کے۔ معلوم نہیں ۱۲۶۸ھ کی کیا خصوصیت ہے۔ جب غالبؔ خاندانِ تیموری کی تاریخ لکھنے پر مقرر ہوئے تو وہ سال (۲۳ر شعبان) ۱۲۶۶ھ (۴ر جولائی۔ ۱۸۵۰ء) تھا۔ جمادی الثانی ۱۲۶۷ھ (مارچ ۱۸۵۱ء) تک ہمایوں کی جلاوطنی اور واپسی تک کا بیان لکھا جا چکا تھا۔ جمادی الاول ۱۲۶۸ھ (مارچ ۱۸۵۲ء) تک کام رکا رہا۔ جمادی الاول تا شعبان و رمضان ۱۲۶۸ھ (مارچ ۱۸۵۲ء تا جون ۱۸۵۲ء) میں یہ رد و بدل ہوا کہ اب تاریخ ابتدائے آفرینشِ عالم و آدم سے شروع ہو۔ غالباً اسی مقام سے ولی عہد بہادر مرزا فخرو نے اس میں براہ راست دلچسپی لینی شروع کی ہوگی اور اس لئے ۱۲۶۸ھ کی مہر چھاپی گئی۔

(ب) نیر درخشاں نے کتاب کی طباعت کی تاریخ اس شعر میں لکھی ہے۔

گراں بر رفت در فخر المطابع
ربیع دومیں ا روز سابع

یعنی ۷ر ربیع الثانی ۱۲۷۱ھ (مطابق ۲۸ر دسمبر ۱۸۵۴ء) کو فخر المطابع سے چھپی۔

(ج) نسخہ ۲ جو غالبؔ نے نواب وزیر الدولہ والی ٹونک کو نذر کیا تھا۔ وہ ۲۷ر جمادی الثانی ۱۲۷۱ھ کو نواب صاحب کے کتب خانے میں داخل ہوا۔ یہ ہجری تاریخ ۱۷ر مارچ ۱۸۵۵ء کے مطابق ہے۔ گویا یہ نسخہ چھپنے کے دو مہینے ۲۰ روز بعد کتب خانۂ ٹونک راج میں داخل کیا جا چکا تھا۔ بطور خاص جلد بندی، اس توجہ سے تصحیح کہ تتمہ، تشدید اور مدتک کے اضافے

لفظوں، مرکزوں، حرفوں اور لفظوں تک میں کمی بیشی۔ قلم اور چاقو کی نوک سے تراش خراش، سو سے زیادہ جگہوں پر، اور یہ سب غالب کے اپنے ہاتھ سے بغیر ذرائع آمد و رفت کی کمی اور دور و دراز مقامات۔

نشر و اشاعت کا فن کوئی غالب سے سیکھے۔

دعاے صباح

ڈاکٹر سید معین الرحمن فرماتے ہیں۔[۱]

" دعائے الصباح " حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منسوب عربی زبان میں ایک دعا ہے۔ " مثنوی دعای صباح " اسی دعا کا منظوم فارسی ترجمہ ہے۔ غالب نے یہ ترجمہ اپنے بھانجے مرزا عباس بیگ کی فرمائش پر کیا تھا۔ غالب کے خطوں یا ان کی دوسری تحریروں میں اس ترجمے کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ غالب کے تلامذہ اور معاصرین کی تحریریں بھی اس سلسلے میں خاموش ہیں۔
" آبِ حیات " (۱۸۸۰ء) اور یہاں تک کہ " یادگارِ غالب " (۱۸۹۷ء) بھی، اس منظوم ترجمے کے ذکر سے خالی ہے۔ خوش قسمتی سے مولانا امتیاز علی عرشی کو اس مثنوی کا ایک قلمی نسخہ کتاب خانۂ رامپور کے ایک مجموعے میں دستیاب ہوا اور انہوں نے اہلِ علم سے

---

[۱] غالب کا علمی سرمایہ از ڈاکٹر سید معین الرحمن ، یونیورسل بکس ، لاہور۔ فروری ۱۹۸۹ء۔ ص ۲۳۶ تا ۲۴۴۔

اس کا تعارف کرایا ------------

قلمی نسخے کے ترقیمے کی عبارت یہ ہے :

"دعاء ماثور و منقول از جناب امیر علیہ السلام معہ ترجمہ نثر و نیز ترجمہ منظوم مرزا اسد اللہ خاں غالب موسوم بہ دعائے صباح حسب الایمائے مرزا عباس بیگ صاحب ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر لکھنؤ بمطبع منشی نولکشور رونق طبع یافتہ ...... بود بست دسوم شہر رجب سنہ یک ہزار و دو صد و ہشتاد و چہار۔ بندہ حقیر فقیر محمد علی بن سید برخوردار علی امروہوی نقل برداشت" (نگار، لکھنؤ، مئی ۱۹۴۱ء۔ صفحہ ۱۰)

۲۳ رجب ۱۲۸۴ھ مطابق ہے ۲۰ نومبر ۱۸۶۷ء کے ----

۱۹۵۰ء میں فضل اللہ فاروقی نے اس مثنوی کا مطبوعہ نسخہ[1] بھی ڈھونڈ نکالا، انھوں نے "نوائے ادب"، بمبئی، جلد ۱، نمبر ۲، شمارہ اپریل ۱۹۵۰ء میں "غالب کی مثنوی دعاے صباح کا مطبوعہ نسخہ" کے عنوان سے (صفحہ ۵۶-۶۱) اس مثنوی کی اوّلین طباعت کا تعارف کرایا ------------

----

اس مثنوی کی تعدادِ اشعار اختلافی ہے۔ فضل اللہ فاروقی لکھتے

---

[1] یہ حقیقت میں میرے ہی کتب خانے والا نسخہ ہے، جسے میں نے دسمبر ۱۹۷۷ء میں مبسوط مقدمے کے ساتھ ویل پبلی کیشنز، بمبئی سے شائع کیا تھا۔ (رضا)

ہیں کہ :

"مثنوی میں کل ۱۲۴ اشعار دعائے صباح کے ہیں اور ۷ اشعار امام زین العابدین کی مناجات کے ہیں۔ نسخہ منقولہ (عرشی) میں اشعار کی ترتیب وہی ہے جو مطبوعہ نسخے (کشوری) میں ہے"۔

مولانا مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی (مغلپورہ، لاہور) کے ذخیرۂ غالبیات میں "مثنوی" دعای صباح" طبع اوّل (نولکشور) کا ایک نسخہ موجود ہے۔ مولانا فاضل نے اس مثنوی کو اپنی مرتبہ "کلیات غالب فارسی" میں شامل کر لیا ہے۔ اس میں مثنوی کے اشعار کی تعداد ۱۲۰ ہے۔ سات اشعار علاوہ ہیں۔ "کلیات" (مذکورہ) میں ان سات اشعار کے عنوان کی عبارت یہ ہے۔ "ترجمہ دعای امام زین العابدین جو حضرت بعد اس دعا کے پڑھتے تھے"۔

مثنوی" دعای صباح" طبع اوّل کا ایک نسخہ کالی داس گپتا رضا (بمبئی) کے غالب گلکشن میں محفوظ ہے جنہوں نے اسے نسخہ بہ صفحہ فوٹو عکس کے ساتھ شائع کر دیا ہے۔ اس طرح یہ نادر و نایاب اشاعت اب گویا ہر غالب شناس کی دسترس میں ہے۔

ضخامت : ۲۶ صفحات، سائز ۲۰×۲۰/۱۶

تعداد اشعار : ۱۲۴ + ۷

سرورق کی پشت صفحہ ۲ کے دائیں اور ذیلی حاشیے پر فارسی نثر میں اس دعا کی فضیلت اور حضرت علی سے اس کی نسبت

کی سند درج ہے۔ صفحہ ۲ ہی سے " دعا الصباح " کے نسبتاً جلی عنوان کے تحت "بسم اللہ الرحمن الرحیم" کے بعد متن شروع ہوجاتا ہے۔

پہلے نسبتاً جلی قلم سے عربی متن، اس کے نیچے فارسی نثر میں ترجمہ اور پھر منظوم فارسی ترجمہ۔ اس ترتیب سے صفحہ ۱ پر تین شعر آئے ہیں اور صفحہ ۲ پر پانچ شعر۔ صفحہ ۳ کے بائیں حاشیے پر " ھذا الاعتصام یقرا سبع مرات " کے عنوان سے عربی میں ایک دعا ہے جسے " دعاء الصباح " سے پہلے پڑھنا چاہیے۔ صفحہ ۲۴ پر مثنوی ایک سو چوبیس شعروں پر تمام ہوجاتی ہے۔ اس کے بعد صفحہ ۲۴ ہی کی آخری دو سطروں میں جلی قلم سے یہ اردو عبادت ہے :

" اور جناب امام زین العابدین علیہ الصلوٰۃ والسلام سے روایت ہے کہ بعد پڑھنے اس دعا کے سجدے میں یہ دعا پڑھنے "

صفحہ ۲۵ سے حضرت امام زین العابدین سے منقول ایک عربی دعا، فارسی نثر اور نظم میں ترجمے کے ساتھ شروع ہوکر صفحہ ۲۶ کے نصف اول پر ختم ہوجاتی ہے۔ اس ہفت شعری دعا کا آخری شعر یہ ہے :

اے خدا از آسمان آور فرود   بر نبی و آلِ اطہارش درود "

جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے اگرچہ فضل اللہ فاروقی نے ۱۹۵۰ء میں دعائے صباح کے منظوم ترجمے کی اوّلین اشاعت کا تعارف کرا دیا تھا تاہم قیاس چاہتا ہے کہ مولانا مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی کی نظروں سے اوّلین اشاعت کبھی نہیں گزری

ان کا یہ دعوئے قطعاً غلط ہے کہ مثنوی دعائے صباح طبع اوّل نولکشور کا ایک نسخہ ان کے ذخیرۂ غالبیات میں موجود ہے۔[۱] جب کہ اشاعتِ اوّل، مَیں نے ایک مبسوط مقدمے کے ساتھ، ۱۹۷۷ء میں شائع کر کے عام کر دی ہے تو اب کوئی بھی اس مثنوی کا اور جناب فاضل کی شائع کردہ مثنوی، مشمولہ کلیاتِ غالبؔ فارسی، کا مقابلہ کر کے دیکھ سکتا ہے کہ دونوں مثنویوں میں زمین آسمان کا فرق ہے حتّٰی کہ اصل مثنوی کے کل شعر (۱۲۴ + ۷) ۱۳۱ ہیں اور فاضل صاحب کی مثنوی کے کل اشعار (۱۲۰ + ۷) ۱۲۷ ہیں۔ اس کے علاوہ شعروں میں بھی بہت فرق ہے۔ اس طرح اب بھی میرے کتب خانے کا نسخہ طبعِ اوّل کا واحد نسخہ ہے جو آج تک دستیاب ہو سکا ہے۔

مثنوی کی خامیوں اور خوبیوں اور ترجمے کے حُسن و قبح کی بحث کے لیے التماس ہے کہ میرا شائع کردہ نسخہ مع مقدمہ پڑھا جائے۔

۱۔ اورینٹل کالج میگزین لاہور، فروری ۱۹۵۲ء ص ۵۲ تا ۶۱ اور کلیاتِ غالبؔ فارسی جلد اوّل مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی مطبوعہ جون ۱۹۶۷ء لاہور۔ ص ۱۹ام تا ۴۳۰۔

اشاریہ

[۱۔ کسی ہندسے کے نیچے لکیر سے مراد یہ ہے کہ اس صفحے پر یہ نام ایک سے زیادہ مرتبہ آیا ہے
۲۔ ترتیب بلحاظ حروف تہجی صرف پہلے ہی حرف تک محدود ہے]

۱۔ افراد وغیرہ

ا آ

ک

گ

ل

م

ن

۲۔ کتب و رسائل وغیرہ

ا آ

ب

پ

ت

ٹ

خ

د

ش

ص

ع

غ

ف

ق

۳۔ مقامات وغیرہ

اآ

ب

پ

ت

ج

ح

د

ر

ل

م

ن

ہ

۴۔ ادارے، لائبریریاں، اسکول، کالج وغیرہ

ف

ک

م

۵۔ مطابع وغیرہ

ا

س

ف

م

ن

و

مطبوعہ
غالبیات
از:-
کالی داس گپتا رضاؔ
متعلقاتِ غالب (مضامین) ۳۰ روپے
دعائے صباح (غالب کی ایک منظوم فارسی مثنوی) ۳۰ روپے
غالبیات - چند عنوانات (مضامین) ۵۰ روپے
انتخابِ آتش و غالب از چکبست ۳۰ روپے
دیوانِ غالب (عکسی ۱۸۴۱ء) ۲۰۰ روپے
دیوانِ غالب (عکسی ۱۸۶۲ء) ۱۴۰ روپے
آبِ حیات میں ترجمۂ غالب ۲۰ روپے
دیوانِ غالب (کامل) تاریخی ترتیب سے ۱۶۰ روپے
غالبیات - چند شخصی اور غیر شخصی حوالے ۵۰ روپے
غالب درونِ خانہ ۱۲۵ روپے
غالب کی بعض تصانیف کے بارے میں ۸۰ روپے